حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہنامہ

سب رس

اکتوبر 2017ء

-/30 روپے

ISSN-2278-6902

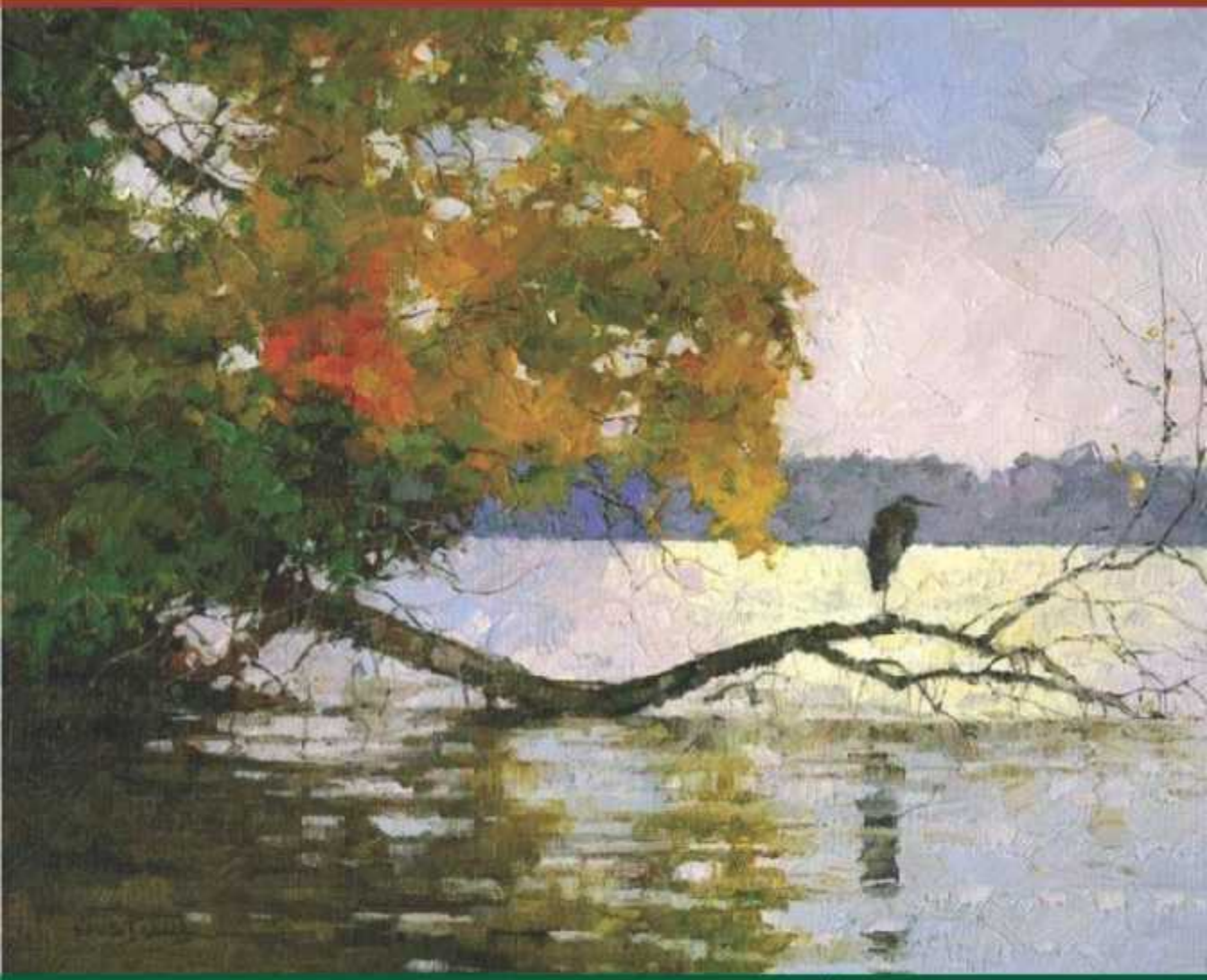

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

جناب محمد محمود علی عزت مآب نائب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ محکمہ اقلیتی بہبود تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کے اشتراک سے عثمانیہ یونیورسٹی صدی تقاریب کے ضمن میں 22 اور 23 مئی 2017ء کو منعقدہ دو روزہ قومی سیمنار کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے۔ شہ نشین پر جناب اے کے خان مشیر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ' جناب سید عمر جلیل سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود' پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر اسکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی' پروفیسر انور معظم سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز عثمانیہ یونیورسٹی' پروفیسر سلیمان صدیقی سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی و شرکاء سیمنار دیکھے جاسکتے ہیں

انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام منعقدہ ممتاز ماہر چشم "ڈاکٹر شیام سندر پرشاد کے ساتھ ایک شام" میں ڈاکٹر شیام سندر پرشاد اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے۔ جناب عابد صدیقی، ڈاکٹر سکندر علی خاں لودھی، محترمہ شانتا سہگل، پروفیسر بیگ احساس (صدر جلسہ) بیگم ڈاکٹر شیام سندر پرشاد، جناب مجتبیٰ حسین، جناب عزیز پاشاہ اور جناب تراب الحسن

بنیاد گزار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۷۹ شمارہ: ۱۰ ماہ: اکتوبر سال: ۲۰۱۷ء

مجلس ادارت

- سرپرست: راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر جی
- صدر: جناب زاہد علی خاں
- معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

- پروفیسر گوپی چند نارنگ
- جناب مجتبیٰ حسین
- پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِ سالانہ **قیمت: -/30**

- ہندوستان: **300روپے**
- کتب خانوں سے: **400روپے**
- پاکستان و بنگلہ دیش: 600روپے
- مغربی و عرب ممالک سے 60ڈالر یا 40پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** **Fax: 040-23374448**

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد .082 500 انڈیا

برقی پتہ: ***E-mail: idarasabras@yahoo.in***

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کر رہی ہیں۔

آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔

آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا مند پسند اور آزمودہ نسخہ

زم زم بہار ہیئر آئیل

• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد و دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم

• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم

• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر

دانتوں کے جملہ امراض' دانت کا ہلنا' دانت میں تکلیف' دانت کا کیڑ' منہ سے بدبو آنا وغیرہ' میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان

جو دیکھے یہی کہے' بہت حسین لگتی ہے۔

®

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS

Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES

Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.

Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال' دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

ایک اور واقعہ	بیگ احساس	06

سفرنامہ

آوارگی تھوڑی سی	مہتاب قدر	08

مضامین

اسرار گاندھی اور تانیثی زاویہ	مہدی جعفر	18
ولی دکنی سے بزرگ مالوہ کا ایک شاعر: روشن علی روشن	کوثر صدیقی	23
اولوالعزم خاتون جمال النساء۔ایک تعارف	آمنہ تحسین	25
پروین شاکر کے نسوانی کرب کا تخلیقی اظہار	نصرت جبین	36
خورشید حیات کی کہانیوں کا فکری محور	محمود شیخ	43
نیر مسعود کے افسانوں میں جادوئی حقیقت نگاری کی بازگشت	عریشہ تسنیم	45

آپ بیتی

یادیں	راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع	49

طنز و مزاح

تماشائے اہلِ قلم	خامہ بگوش	52

افسانہ

آتش فشاں	محمد قمر سلیم	56

شاعری

کرشن کمار طور، محمد عابد علی عابد، نسیم محمد جان، راشد انور راشد، جمال قدوسی، مہتاب قدر، منصور خوشتر، شارق عدیل،	مسعود جعفری، رند سرشار، احمد نثار، اظہار وارثی،	63

مطالعے

مجلّہ ''ادب وثقافت'' کا پانچواں شمارہ	مرزا خلیل احمد بیگ	72
مکالمات پر ایک مکالمہ	رؤف خیر	74

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط	علیم صبا نویدی، پی پی سریواستو رند، محمد ناظم علی، شارق عدیل	78

اداریہ

ایک اور واقعہ.....

''دی وائر'' کی جرنلسٹ روہنی سنگھ کی ایک رپورٹ نے ان دنوں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ ان کی رپورٹ کے مطابق جئے امیت شاہ کی ملکیت والی کمپنی کے ٹرن اوور میں بی جے پی کے 2014ء میں برسر اقتدار آنے کے بعد بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ جس کمپنی کا کاروبار 50ہزار روپے تھا وہ اب 80 کروڑ تک پہنچ گیا ہے۔ روہنی سنگھ نے کسی بینک کے قرض کا بھی ذکر کیا ہے۔ ''دی وائر'' کے ویب سائٹ پر اس کی ساری تفصیلات موجود ہیں۔ یہ وہی روہنی سنگھ ہیں جنھوں نے پرینکا گاندھی کے شوہر وڈورا کے اسکام کا انکشاف کیا تھا۔ بی جے پی کے لیڈروں نے ان کی بے حد ستائش کی تھی۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ جئے شاہ کی تائید میں مرکزی وزرا بیان دے رہے ہیں۔ میڈیا بھی ان کے ساتھ ہے۔ کپل سبل نے جو پریس کانفرنس کی میڈیا نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ پیوش گوئیل کی پریس کانفرنس کو لائیو ٹیلی کاسٹ کیا۔ دی وائر والوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے چند دستاویزات اعداد و شمار کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں۔ انھوں نے کسی پر الزام نہیں عاید کیا۔ اگر یہ سب کچھ غلط ہے تو اس کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف جے شاہ کے والد امیت شاہ نے کہا ہے کہ ان کے فرزند کی کمپنی میں کرپشن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کمپنی کو ایک روپیہ مالیت کی بھی کوئی سرکاری اراضی یا کنٹریکٹ نہیں ملا۔ جئے شاہ نے ''دی وائر'' کے ایڈیٹر اور دیگر چھ افراد کے خلاف میٹرو پولیٹن عدالت احمد آباد میں 100 کروڑ کا ازالہ حیثیت عرضی کا مقدمہ دائر کیا ہے۔ بی جے پی نے اپنے صدر کے فرزند کے خلاف الزامات کو مسترد کرتے ہوئے اس رپورٹ کو جھوٹی اور اہانت آمیز قرار دیا۔ معاملہ عدالت میں ہے وہی اس کا فیصلہ کرے گی۔ قبل از وقت کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ روہنی سنگھ نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ انھوں نے سیاسی پارٹیوں سے ماورا ہو کر کئی دنوں کی مشقت کے بعد ثبوتوں کے ساتھ یہ رپورٹ پیش کی ہے۔ انھوں نے کسی کی بے عزتی نہیں کی۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں فون پر جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ ان کی کردار کشی کی جا رہی ہے۔ ان پر فحش الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ ان کے کردار پر کیچڑ اچھالا جا رہا ہے۔ جن منتریوں نے وڈورا کیس میں انھیں مبارک باد دی تھی وہ آج ان کے مخالف ہو گئے ہیں۔ فیک آئی ڈی سے ایک ہی قسم کے ٹوئیٹ ان کے خلاف کیے جا رہے ہیں۔

یہ رویہ انتہائی قابل اعتراض ہے۔ صحافتی آزادی کو طاقت کے زور پر کچلنے کا غلط اقدام ہے۔ صحافی چوں کہ خاتون ہے اس

لیے اس کے ساتھ یہ طریقہ اپنایا جا رہا ہے۔ روہنی سنگھ کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں بھی دی جا رہی ہیں۔ اصولاً عدالت کی کاروائی اور فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔ ادھر اپوزیشن بھی اس کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

عوام اور دانشور طبقے کو توقع تھی کہ شاہی نظام کی موروثیت جو جمہوریت میں بھی در آئی ہے بی جے پی کے دور میں اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ملک کو کروڑوں کے اسکامس سے نجات ملے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ ہمارے جمہوری سسٹم میں بے شمار خرابیاں آ گئی ہیں۔ کروڑوں روپے خرچ کر کے عوامی نمائندے منتخب ہوتے ہیں اور پانچ برس میں وہ اپنا سارا پیسہ مع سود وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سرکاری رعایتوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پارٹی فنڈ کے لیے بڑی بڑی کمپنیوں سے پیسہ لیا جاتا ہے اس لیے انھیں مراعات دینی پڑتی ہے۔ سادھو اور سنت بھی بزنس اور سیاست میں داخل ہو چکے ہیں جو دنیا کو مایا جال سمجھتے تھے۔ رام دیو ملک کے بڑے بزنس میں بن گئے ہیں۔ خاتون کے لباس میں مجمع سے فرار ہونے والے شخص کی کمپنی کا ٹرن اوور کروڑوں روپے ہے۔ ادھر یوگی اپنے انداز سے حکومت چلا رہے ہیں۔ انھوں نے ایودھیا میں دریائے سریو کے کنارے بھگوان رام کا دیو قامت مجسمہ نصب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ٹورازم کی فہرست سے تاج محل کو خارج کر دیا گیا۔ بی جے پی سارے پرانے نشانات مٹا کر اپنے نقش ثبت کرنے کی چکر میں ہے طالبانی رویہ ہے جو انھوں نے بدھ کے مجسموں کے سلسلے میں اختیار کیا تھا۔ دوسری طرف بدھ مت کے ماننے والے خون کی ندیاں بہا رہے ہیں۔ ملک کی معاشی صورت حال پر خود بی جے پی کے رہنماؤں نے تشویش کا اظہار کیا ہے۔ عام آدمی پریشان ہے۔ بے روزگاری کی شرح میں بے تحاشہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سب سے زیادہ خطرہ صحافتی آزادی کو ہے۔ ہمیں امید ہے وزیر اعظم صحافتی آزادی بحال کرنے کی جانب توجہ کریں گے کچھ ایسے اقدامات کریں گے جس سے خوف کی یہ فضا ختم ہو جائے۔ جب تک اپنی کمزوریوں کا علم نہ ہوگا اصلاح بھی ممکن نہیں ہو سکتی۔

اس شمارے میں ہم حسب وعدہ شاعری شامل کر رہے ہیں ہمیں خوشی ہے کہ ہماری گزارش پر معتبر شعراء نے اپنے کلام سے نوازا ہے۔

بیگ احساس

سفرنامہ

مہتاب قدر

آوارگی تھوڑی سی (پہلی قسط)

اس کو اعتراف گناہ نہ سمجھا جائے، یہ احساس ندامت ہے کہ باوجود شخصیت میں شرافت کے کئی گوشے نمایاں ہیں شاعری اور شاعر مزاجی فطرت میں شوخی وشرارت کی تھوڑی بہت رمق چھوڑ ہی جاتی ہے۔ سدھرنے کے مواقع سنا ہے زندگی میں ہر شخص کو کبھی نہ کبھی میسر آجاتے ہیں مگر بگڑنے کے امکانات ہمیشہ پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے بھی سدھرنے کے لئے متواتر کئی سفر کئے تلنگانہ آندھرا، گجرات، راجھستان مہاراشٹرا کرناٹک بھی گئے، چند سدھرے ہوئے اور چند سدھائے ہوئے لوگوں کے ساتھ سب علاقوں کی خاک چھانی۔ بلکہ سعودی عرب آئے تو مصر، اردن بھی گئے اور ایک ذاتی بلکہ پیشہ ورانہ کام سے متحدہ امارات جانے کا بھی موقع ملا۔

ہجرتیں مقدر ہو جائیں تو پھر شہر کیا، ملک کیا، بحر و بر اور فضائیں سب ہی سفر کا حصہ ہوا کرتی ہیں۔ عرض مقدس پر قدم رکھا تو معطر فضائیں، مقدس راہیں ثواب وعذاب کے قصے، وعدہ ووعید کی باتیں شب و روز کا معمول بن تو گئیں، مگر زبان کی چاشنی اور تہذیب کا وہ اثاثہ جو ساتھ لے کر چلے تھے دامن چھوڑتا ہی نہ تھا۔

جدہ آمد کے بعد پہلی دعوت تھی جہاں کئی نورانی چہرے نظر آئے وہیں ایک چہرے پر شعروادب کی چمک دمک بھی دکھائی دے رہی تھی غائبانہ تعارف ہو چکا تھا یہ اعتماد صدیقی ہیں اور شعروادب کے دلدادہ ہی نہیں بلکہ شعر کہتے بھی ہیں، سوجدہ میں کسی بھی ادب دوست سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ بہت جلد ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا اور چند مزید ساتھیوں کے ہمراہ ۹۷۹۱ میں جدہ کی پہلی اردو تنظیم حلقہ ارباب ذوق جدہ کا قیام عمل میں آیا۔ حلقہ ارباب ذوق سے گلف اردو کونسل تک تنظیموں اور کارکردگیوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے جس کی داستان کسی سفرنامے میں بہت محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ تنظیموں کے ساتھ ساتھ مشاعروں اور مہمانوں کی پذیرائیوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

آنے والے مہمانوں میں کچھ وہ ہوتے جو حج وعمرے کی سعادت کے لئے برصغیر ہندوستان و پاکستان سے مکہ مدینہ میں شرف حاضری پاتے اور کچھ وہ جو خلیجی ملکوں اور دیگر مشرق وسطی کی ریاستوں سے تشریف لاتے۔

یہاں صرف خلیجی ریاستوں کے زائرین کا تذکرہ مقصود ہے اس لئے اول الذکر کو پھر کسی موقع کے لئے چھوڑتا ہوں۔ خلیجی ریاستوں سے آنے والوں سے عموماً تعارف وتعلق کا سلسلہ نیا نہ ہوتا کہ پہلے اردوستان ڈاٹ کام کی برکتوں نے عمومی طور پر بیرون ہند و پاک مقیم شعرا وادبا سے رابطے استوار کر دیئے تھے پھر امریکہ میں مقیم حیدرآباد کی محترمہ سارہ جبین کی ویب سائٹ اور فورم اردو بندھن نے تعلقات کو اور بڑھا وادیا پھر اردو گلبن ویب سائٹ اور بزم اردو گلبن جدہ کے قیام نے خلیج کے تمام یا اکثر شعرا وادبا سے روابط نہ صرف بڑھا دیئے بلکہ انکی آمد و رفت کی اطلاعات بھی ملتی رہیں اور ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی چل پڑا۔

ملاقاتیں ہوتیں تو ہمیشہ ایک بات جو سب ملاقاتوں میں مشترکہ طور کہی سنی جاتی وہ یہ تھی کہ ہم خلیجی ملکوں میں رہنے والوں کا ایک پلیٹ فارم ہونا چاہئے، اگرچہ کہ اردو گلبن ڈاٹ کام نے یہ کام بڑی حد تک انجام دیا تھا مگر کمی اس کی تھی کہ سب یا ہم سب کے نمائندے ایک محفل میں جمع ہو سکیں، اس سلسلے میں جس خلیجی شاعر

وادیب سے بات ہوتی وہ خیال کو سراہتے ہوئے تعاون کی پیشکش فرماتے، مگر بات پھر جہاں کی وہیں رہ جاتی کہ مختصر ملاقاتوں کے وعدے حیسنوں کے وعدوں کی طرح ایفا یعہد سے مربوط ومشروط نہیں ہوتے۔ اسی ضمن میں دو ہزار چودہ ۴۱۰۲ تک جن احباب سے گفت وشنید ہوئی ان میں جناب افروز عالم برادرم شہاب الدین، جلیل نظامی، سید فہیم، فرتاش سید، احمد اشفاق اور سعودی عرب میں برادرم فراست علی خسرو، سہیل ثاقب، محترم اطہر نفیس عباسی جناب بدرانصاری، نادرخان سرگروہ، فیصل طفیل اور دیگر رفقا سے مشورے کافی دنوں سے چل رہے تھے۔ بالاخر گلف اردو کونسل کے قیام کی تجویز پر کچھ دوستوں نے حامی بھرلی جن میں پہلا نام افروز عالم کا ہے پھر ہم دونوں کی رائے کے مطابق تمام ریاستوں سے دو یا اس سے زائد نام طے کئے گئے انہیں دعوت دی گئی اکثریت نے شرف قبولیت بخشا، سو کاوشیں تیز ہوگئیں۔ پہلا پروگرام جدہ میں ہونا طے پایا جس کے لئے تیاریں قبل از وقت ناگزیر تھیں۔ سو میرے ساتھ جدہ میں مشاعروں کے لئے کافی تجربہ کار شخصیت بدرانصاری بھی تھے۔ حضرت مجاہد سید، فضاالرحمٰن صاحب اطہر نفیس عباسی صاحبان نے کافی حوصلہ بڑھایا۔ پاکستان سے ایک اور ہندوستان سے ایک قداور شخصیت کو مدعو کرنا بھی پروگرام کے مطابق طے پا گیا، جس کی خبر کونسل کے واٹساپ گروپ کو بھی دے دی گئی۔ پاکستان سے پروفیسر پیرزادہ قاسم اور ہندوستان سے شمس الرحمٰن فاروقی کے اسمائے گرامی منتخب کئے گئے۔ پیرزادہ قاسم سے مبصر اعظم اور اطہر عباسی صاحب نے بات کی انہیں رسمی دعوت نامہ بھی گلف اردو کونسل کی جانب سے بھیجا گیا جسے موصوف نے بخوشی منظور فرمایا۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی سے بھی خط وکتابت جاری تھی جنہوں نے آنے کا وعدہ تو فرمایا تھا مگر صحت کے کچھ مسائل تھے جس کے سبب محترم واضح طور پر نہیں بتا پا رہے تھے آخر کار ہمیں پھر دوسری شخصیت کا نام سوچنا پڑا جو احباب کے مشورے سے ہی پروفیسر ارتضی کریم کی تھی۔ قومی کونسل برائے ترقی اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے چند ماہ پہلے ہی مجھے دہلی میں منعقدہ تیسری عالمی اردو کانفرنس کا دعوت نامہ بھیجا تھا۔ جس میں خاکسار اپنی ذاتی اور کچھ سرکاری یعنی اقامے کی مجبوری کے باعث ان سے وعدہ کرکے بلکہ کوشش کرنے کے باوجود شریک نہ ہوسکا تھا موصوف سے کانفرنس کے ضمن میں فون پر بھی رابطہ ہو چکا تھا۔ بہرحال جب پروفیسر ارتضی کریم کا نام طے ہوا تو منظر بالکل صاف تھا قومی کونسل کی خدمات کا سین میرے سامنے تھا اس لئے خوشی ہوئی کہ ایک مجاہد اردو کو ہم دعوت دے رہے ہیں۔ مئی ۶۱۰۲ میں دوروزہ پروگرام پورے شان واحتشام کے ساتھ منعقد ہوا۔ دونوں ملکوں کی بڑی شخصیات نے رونق بخشی۔ اس کے بعد قطر میں برادم شہاب الدیں احمد نے بھی مدعو کیا تھا سو وہاں بھی وہی مجبوریاں درپیش تھیں میں اس میں شرکت نہ کرسکا۔ تاہم قطر کے پروگرام کے بعد عمرے کے لئے اس پروگرام میں شریک پروفیسر صفدر امام قادری، سکرٹری اردو اکاڈمی بہار مشتاق احمد نوری صاحب اور ڈرامہ نویس داستان گو شاعر جاوید دانش جدہ تشریف لائے تو مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ میری قطر پروگرام میں عدم شرکت کے باعث برادرم شہاب الدین نے مومنٹو بھی انہی حضرات کے ذریعے جدہ بھیج دیا۔ اس طویل تمہیدی گفتگو کے بعد، اصل سفرنامے کی طرف آتے ہیں۔ جس کا آغاز ۵۱ مارچ ۷۱۰۲ کو ہوا۔ سن ۷۱۰۲ کی جنوری میں پھر اطلاع ملی کہ قومی کونسل اپنی چوتھی عالمی اردو کانفرنس مارچ میں کرنے جارہی ہے اور اس میں شرکت کا حکم بھی ملا اور ساتھ ہی مقالے کا عنوان بھی دے دیا گیا کہ ''سعودی عرب کے عالمی مدارس میں اردو تعلیم کی صورت حال، ایک جائزہ''
کوشش کی اور دو ماہ کی تگ ودو کے بعد مقالے کی شکل وصورت بھی

ابھر کر آ گئی اور اقامے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

پندرہ مارچ کی شب جدہ سے عمان ائر کے طیارے میں سوار ہوے اور مسقط ہوتے ہوے جہاں ائر پورٹ پر دو تین گھنٹے کا قیام رہا مسقط میں مقیم اپنے دوست بڑے بڑے مشاعرے منعقد کرنے والے قمر ریاض کو یاد کرتے رہے کہ کہیں نظر آ جائیں مگر اطلاع کے بناوہ کیسے آسکتے تھیبہر حال ٦١ کی صبح دہلی پہنچے، جبیل میں عرصہ دراز تک مقیم سعید منتظر نے جواب دہلی واپس جا چکے ہیں اور وہیں مقیم بھی ہیں بلکہ حیدرآباد میں بھی اپنی دوسری شریک حیات کی وجہ سے آتے جاتے ہیں، فرمایا تھا کہ وہ دہلی ائر پورٹ سے مجھے لے کر اشوکا ہوٹل جس میں بیرونی مندوبین کے لئے قومی کونسل کی جانب سے قیام کی سہولت میسر ہے پہنچا دیں گے۔ ائر پورٹ پہنچ کر سعید بھائی کو فون کیا، تھوڑی سی کوشش کے بعد رابطہ ہو گیا۔ سعید بھائی نے اطلاع دی کے ان کے ایک دوست جناب سکندر عاقل جو میرے اعزاز میں ایک مشاعرہ کا بھی اہتمام فرمانا چاہتے ہیں مجھے لینے ائر پورٹ تشریف لائیں گے، سکندر عاقل سے رابطہ ہوا اور ان تک پہنچ کر انکی کار میں سوار ہو گئے صبح کا وقت تھا، مجھے رسمی طور پر اشوکا ہوٹل میں چار بجے تک رپورٹ کرنی تھی، اس کی اطلاع سکندر عاقل کو دے دی تھی سو انہوں نے کہا کہ آپ دوپہر تک میرے گھر رہیں وہاں سے میں آپ کو اشوکا ہوٹل پہنچا دوں گا۔ میں نے حامی بھر لی یہ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا دولت خانہ دہلی کے حدود سے باہر ہریانہ کی سرحد پر واقع ہے جسے گرگاوں کہتے ہیں۔ گرگاوں جاتے ہوے ڈر لگ رہا تھا کہ یہ نئے میزبان شہر کی سڑکوں سے پرے دیہاتی راستوں پر اپنی کار دوڑا رہے تھے، اندیشہ کو بھانپتے ہوے خود موصوف نے یہ بتایا کہ دراصل اس وقت شہر کی سڑکوں پر بھیڑ بھاڑ بہت ہوتی ہیاس لئے پیچھے کے راستوں سے ہم اپنے گھر جا رہے ہیں۔ ہم کسی بھی مشورہ دینے یا اظہار پسندیدگی یا نا پسندیدگی کا کوئی حق نہیں رکھتے تھے، مردہ بدست زندہ کی طرح چپ چاپ بلکہ ان کی باتوں کی طرف پورے انہاک سے سماعتوں کو وا کئے چلتے رہے۔ گرگاوں پہنچے سکندر عاقل کا دولت خانہ ایک چھوٹے سے ڈوپلکس ولا کی صورت ہمارے سامنے تھا۔ تاجر پیشہ سکندر عاقل بہت خلیق اور ادب نواز آدمی نکلے، چاے پیش کی گئی پھر ناشتہ لگا، انکی اہلیہ اور بچوں سے تعارف بھی کروایا۔ بچے ماشاللہ نئی تہذیب کی پراگندہ ریاکاری بناوٹی اخلاق سے پرے مشرقی تربیت کے مظہر تھے، بھابی سے ملاقات ہوئی تو تربیت کا راز کھلا کہ سادگی اور سلیقے کا حسن امتزاجی کیفیت کے ساتھ ان کی شخصیت کا حصہ نظر آیا۔ دوپہر تک کے لئے ہمیں مہمان خانہ دکھا دیا گیا جہاں بیڈروم کے ساتھ منسلکہ واش روم بھی تھا۔ تھکے ہارے ہونے کے باوجود نیند نے چند لمحوں سے زیادہ آنکھوں میں بسیرا نہ کیا اور ہم تیار ہو کر نیچے میزبان کے در دولت پر پہنچ گئے دوپہر کا کھانا لگا اور پھر کار میں اشوکا ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ درمیان میں سکندر عاقل سے کئی ادبی اور غیر ادبی موضوعات پر گفتگو بھی ہوئی اور انکی شاعری خصوصا انکے قطعات سننے کا موقع ملا۔ جیسے وہ نفیس حق گو آدمی ہیں ویسی ہی انکی شاعری میں بھی بلا جھجک سچ بولنے کی عادت نمایاں تھی۔

اشوکا ہوٹل کی سرحد میں داخل ہوے تو مجاہد اردو ارتضی کریم سیڑھیوں پر ہی مہمانوں کا استقبال کرتے نظر آے۔ ''ہندوستان اور بیرونی ممالک میں اردو زبان وادب کا منظر نامہ'' کے موضوع پر کناڈا، برلن جرمنی، ایران، سعودی عرب، انگلینڈ، ماریشس، قطر، ترکی، دبئی، امریکہ اور ازبکستان کے تیس سے زیادہ مندوبین وسفیران اردو شعر وادب کے علاوہ ملک کی تمام ریاستوں کے نمائندے بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لا چکے تھے۔ سکندر عاقل سے رخصت لی اور کار سے ہوٹل کے عملے نے سامان اتارا، ساتھ ہی پروفیسر ارتضی نے حکم صادر کر دیا

کہ سامان ہوٹل کے لوگ آپ کے کمرے میں پہنچا دیں گے آپ فوراً میٹنگ ہال میں چلیں وہاں منسٹر صاحب آنے والے ہیں آپ تمام مندوبین سے گفتگو کریں گے۔ عجب مرحلہ درپیش تھا، ہم قلندر مزاج لوگ منسٹروں سے کیا بات کریں گے اور کیا کرنی چاہیئے ہمیں تو شاہی اور سرکاری آداب والقاب کا بھی زیادہ علم نہ تھا، حکم میزبان مرگ مہمان کیا کرتے میٹنگ روم کی طرف گئے جہاں پہلے سے کافی ساتھی جمع تھے جن میں بیرونی مندوبین کے علاوہ قومی کونسل کے سرکاری عہدیداروں کی خاصی تعداد بھی تھی۔ بعض چہرے شناسا لگ رہے، آج کل فیس بک کیا ادبی حلقوں میں شمولیت کے سبب کافی چہرے دیکھتے دیکھتے شناسا لگنے لگتے ہیں اور جب پہلی بار بھی کہیں ٹکراتے ہیں تو لگتا نہیں کہ پہلی دفعہ ملاقات ہوئی ہو۔

منسٹر مہندر ناتھ پانڈے کے ساتھ بیرون سے پہنچے ہوئے مندوبین میں جدہ سے خاکسار کے علاوہ جاوید دانش کنیڈا، فہیم اختر انگلینڈ، زینب سعیدی تہران اور وفا یزدان منش تہران اور دیگر موریشس وغیرہ کے ساتھی بھی شامل تھے، یہ ملاقات بہت خوبصورت اور یادگار اس لئے بھی رہی کہ وزیر موصوف نے سب کی بات بہت دلچسپی سے سنی اور پروفیسر ارتضی کریم کو اس پر نوٹ لینے کی ہدایات بھی دیں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات کو سب نے سراہا اور ساتھ ہی میں نے جب قومی کونسل کو ملکی سرحدوں سے باہر آ کر خلیجی ممالک اور سعودی عرب میں اپنی کانفرنس کرنے کی دعوت دی تو وزیر محترم نے بطور خاص ڈائرکٹر قومی کونسل کو نوٹ کرنے اور عمل درآمد کی طرف توجہ دلائی میں بڑے شش و پنج میں تھا کہ سکندر عاقل اور سعید منتظر نے غالب اکیڈمی میں ملاقات کی سبیل نکالی تھی بعض دوستوں کا خیال تھا کہ میزبانوں کے پروگرام سے پہلے کسی محفل وغیرہ میں شرکت کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ سو طے یہ ہوا کہ میں ڈنر میں شرکت کروں گا اور ملاقاتیں اسی دوران دہلی کے اکابرین اور احباب سے بھی ہو جائیں گی۔ ارتضی کریم سے ذکر کیا کہ احباب ڈنر پر بلا رہے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو شریک ہو جاوں۔ ارتضی صاحب نے فرمایا، جائیں وہ آپ کو یوں تو نہیں چھوڑ دیں گے ان کا اشارہ مشاعرے کی طرف تھا۔ بہرحال مشاعرہ تو تھا مگر مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ کتنے لوگ جمع ہیں غالب اکیڈمی تک قومی کونسل کے ایک عہدیدار کے ذریعے پروفیسر ارتضی صاحب نے بھیجا تھا، وہاں پہنچا تو سجے سجائے اسٹیج پر مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ شہلا نواب مشاعرے کی خوبصورت نظامت کر رہی تھیں۔ شہ نشین پر دیگر شعرا کے علاوہ جانے پہچانے چہروں میں سعید منتظر بھی تھے اور مینا خان بھی شہلا نواب کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ حسب پروگرام مجھے سامعین میں بیٹھنا تھا اور صرف مشاعرہ سننا تھا پڑھنا نہیں کہ میری شرکت تصویروں میں نہ آ جائے مگر جب بینر پر نام اور پروگرام لکھا ہو تو اس تکلف کی ضرورت نہ تھی سو میں شہہ نشین پر پہنچ گیا۔ سکندر عاقل اور دیگر احباب نے استقبال فرمایا۔ میں عمدا تاخیر سے پہنچا تھا کیونکہ صورت حال کی خبر نہ تھی سو چند نوجوان شعرا کلام پڑھ چکے تھے۔ بزرگ شاعر محترم ابرار کرتپوری کی صدارت تھی، مقامی شعرا نے اپنا کلام پڑھا۔ شہلا نواب جو ایک جاذب نظر شخصیت کی حامل ہیں اپنی مسکراہٹوں سمیت نظامت فرما رہی تھیں ان کی نظامت میں بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دوران نظامت میرے اشعار کے ساتھ تمام شعرا کو دعوت کلام دے رہی تھیں۔ غالبا یہ اس وجہ سے تھا کہ میں نے اپنا کلام خود پڑھنے کو قرین مصلحت نہ سمجھا تھا مگر صورت مشاعرہ نے مجھے اکسایا کہ اس خوبصورت موقع کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کر دینا غیر شاعرانہ حرکت تھی، پہلے کبھی سوچا نہ تھا کہ ایسے عجائب بھی دیکھنے کو ملیں گے۔ ایک دینی سفر کے دوران بنگلہ والی مسجد پہنچے تو

مزار غالب کی زیارت سن ۲۰۰۰ میں کی تھی اور تبھی غالب اکڈیمی کا بورڈ بھی دیکھا تھا یہ اندازہ نہیں تھا کہ کبھی اس غالب اکیڈمی میں دہلی کے نامور اور غیر نامور سبھی شعرا کے ساتھ مشاعرہ پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوگی۔ شعری میزبانی سے فرصت ملی تو لذت کم ودہن کا اعلان ہوا۔ منتظمین اور شعرا کے لئے کھانے کا انتظام بہت معقول مگر پڑوسی ہوٹل کے تہہ خانے میں تھا جہاں پہنچنے میں تھوڑی سی نامعقولیت کا احساس ہوا، کھانا دہلی کی روایتوں اور لذتوں کا امین تھا۔ کھانے کیدوران دوستوں سے کھل کر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ خالد فریدی انہی سے سنا کہ وہ جدہ میں عرصہ تک مقیم رہ چکے تھے اگر چہ کہ مجھے انکے جدہ قیام کا زمانہ یاد نہیں آرہا تھا بہر حال وہ جدہ کے حال احوال اور ساتھیوں کو پوچھتے رہے اور میں بتاتا رہا۔ بعض شعرا اور شاعرات کے ساتھ تصاویر ایسے موقعوں کی روایت رہی ہے سو اس سے بھی گزر آے۔ خواتین میں مینا خان کو پہلی بار روبرو سننا اچھا لگا کہ محترمہ سے آن لائن رابطہ اور سننا سنانا ہو چکا تھا اور انکی شعری صلاحیتوں کے ہم معترف تو تھے ہی براہ راست سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مشاعرہ زدہ خواتین کی نئی نسل میں مینا خان ایک سچی شاعرہ اور بردبار شخصیت بن کر ابھر رہی ہیں۔ ایک اور کہنہ مشق شاعرہ رشیدہ باقی حیا صاحبہ نے بھی گو اسٹیج پر نہیں تھیں مگر جب انہیں شعری دعوت دی گئی تو بہت خوبصورت کلام سے نوازا جس سے انکی کہنہ مشقی اور علمی وادبی تشخص کا اندازہ ہو رہا تھا۔ سعید منتظر اپنی خوبصورت آواز اور شگفتہ شاعری سے نوازتے رہے اور دیگر شعرا کے بعد صدر مشاعرہ حضرت ابرار کرتپوری کو بھی سنا اور ان کی استادانہ شاعری کے قائل ہو گئے۔ رات دیر گئے اشوکا ہوٹل واپس پہنچے۔ سب ساتھی اپنی اپنی قیام گاہوں میں آرام فرما تھے اس لئے ہم بھی چپ چاپ اپنے کمرے پر پہنچ کر آنے والے کل کے پروگرام کی تصوارتی تیاری کرنے لگے۔

دوسرے دن ۱۷ مارچ کی صبح پروگرام کا پہلا دن تھا، چوتھی عالمی اردو کانفرنس ''ہندوستان اور بیرونی ممالک میں اردو کا منظر نامہ'' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام حکومت ہند کی وزارت ترقی انسانی وسائل کی چھتر چھایہ میں آغاز کے مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ صبح سویرے ناشتے کے لئے ہوٹل کی کینٹین میں جمع ہونا تھا۔ شہاب الدین بھی دہلی پہنچ گئے تھے۔ پروفیسر ارتضی کریم کے ہمراہ ان کی اہلیہ محترمہ بھی ناشتے کی میز پر تشریف رکھتی تھیں دیگر تمام ساتھی بھی ایک کے بعد دیگرے جمع ہونے لگے مختلف میزیں مہمانوں سے سج گئیں۔ ناشتہ کے بعد، اشوکا ہوٹل کے خوبصورت وسیع وعریض ہال میں پہنچے جہاں وزیر محترم پرکاش جاڈیکر کو کانفرنس کا افتتاح کرنا تھا۔ مگر ہوا یوں کہ انہی دنوں حکمران جماعت نے اتر پردیش میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی اور ہائی کمان کے احکامات اور مشوروں کے لئے مرکزی وزرا اور اہم کارکنان جماعت مصروف ہو گئے تھے سو افتتاحی اجلاس میں مرکزی وزیر پرکاش جویڈکر خود تشریف نہ لا سکے اور وزیر مملکت مہندر ناتھ پانڈے نے انکی نیابت میں پہلے اجلاس کی پہلی شمع روشن کی جبکہ یہ تجربہ اور مشاہدہ ہمارے لئے کم از کم نیا تھا کہ شمع جلانے کے بعد اسی سیاسٹیج پر موجود دیپکوں کی ایک کہکشاں روشن کرنی تھی، پھر یوں ہوا کہ ڈاکٹر ارتضی کریم کے ہمراہ، مہندر ناتھ پانڈیکے بعد ایک ایک دیپ مختلف مہمانوں کے ہاتھوں روشن ہوا۔ افتتاحی دیپ روشن کرنے والوں میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، جناب شہنواز حسین سابق وزیر کے علاوہ ایک اور وزیر بھی تھے۔ رسمی کاروائی کے بعد افتتاحی اجلاس کا آغاز ہوا۔ وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل ڈاکٹر مہندر ناتھ پانڈے نے اپنی افتتاحی تقریر میں اردو کی خوبصورتی اور ہمہ گیریت پر روشنی ڈالتے ہوے اردو کو ہر طبقے کی زبان قرار دیا۔ موصوف نے کونسل کے کاموں اور کاروائیوں کی

تعریف بھی کی اور دینا بھر سے اردو والوں کی آمد وشرکت پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوے بیرونی مندوبین کا حکومت ہند کی جانب سے استقبال کیا جس پر دیر تک تالیوں کی گونج سنی گئی۔ سابق وزیر اور حکومتی جماعت کے نمائندے (اسپوک پرسن) نے بہت شستہ اردو میں تقریر کی اور اردو کاوشوں کو ایک تحریک بنانے کی اہمیت پر زور دیا۔ ساتھ ہی قومی کونسل اور تمام محبان اردو کو اردو کے گھر گھر پہنچانے کی ذمیداری کا احساس بھی دلاتے ہوے ایک خاص جملہ بہت دلچسپ انداز میں کہا کہ ''وہ پارٹی کے سرکاری ترجمان تو ہیں مگر اردو کے پیدائشی ترجمان ہیں''، پھر ایک بار ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ارتضی کریم نے اپنی منصبی ذمہ داری نبھاتے ہوے شہ نشین سے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور حکومتی ذمہ داروں سے ۳ مارچ کو یوم اردو قرار دینے کی خواہش کا اظہار بھی فرمایا جس کی حاضرین کی جانب سے تالیوں کے ذریعے بھرپور تائید کی گئی۔ افتتاحی دور کا کلیدی خطبہ برصغیر کے نامور نقاد اور محقق پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے پیش فرماتے ہوے زبان کی تاریخ اور تکنیکی ساخت و پرداخت پر روشنی ڈالی۔ دیگر مخاطب کرنے والوں میں معروف فکشن نگار سید محمد اشرف بھی شامل تھے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد شام کی ساعتوں میں تفریحی پروگرام ترتیب دیئے گئے تھے جن میں ایک داستان گوئی اور دوسرا گائکی کا پروگرام تھا۔

داستان گوئی ہماری تہذیبی تاریخ کا اہم حصہ رہی ہے عرصہ دراز سے یہ صنف سخن ناپید ہو رہی تھی، کچھ دنوں سے اسے دوبارہ زندگی ملی کہ جاوید دانش جیسے فنکاروں نے اس کیا حیا کی کوششیں تیز کردی ہیں اسی ضمن میں جاوید دانش کا یہ پروگرام ''داستان ہجرتوں کی'' پیش کیا گیا۔ داستان پر گفتگو سے پہلیمیں داستان گو جاوید دانش کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرنا چاہتا ہوں، جاوید دانش کی طرح انکی نادر صنف سخن داستان گوئی بھی غیر معمولی دلچسپی کا محور تھی۔ جاوید دانش شاعر اداکار (یعنی ڈرامہ آرٹسٹ ڈرامہ باز ہرگز نہیں) ڈرامہ نگار اور کنیڈا کی کلغی بھی سر پر سجی ہوئی کیا پوچھنا جاوید دانش کا، جہاں جاتے سر آنکھوں پہ بٹھاے جاتے، (دلوں کا حال تو اللہ جانتا ہے مگر اندیشہ ہے کہ بعض لوگوں کو ان سے پیشہ ورانہ جلن بھی ہونے لگی ہو، کیا خاص بات ہے جاوید دانش میں ایک عام سا شاعر ایک ڈرامہ نگار ہی تو ہے) نہیں نہیں ایسا نہیں ہے مجھے اور کچھ تو نہیں معلوم مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جاوید دانش ایک طلسمی شخصیت کا نام ہے جس سے ایک بار مل لے وہ دوبارہ ملنے کی خواہش لئے دل میں برسوں انتظار کرتا ہے، کیوں نہ ہو کہ دانش نے شخصیت ہی ایسی پروقار و باغ و بہار پائی ہے۔ لکھنو کے خمیر کو جب بنگال کے جادو نے گوندھا ہو اور علیگڑھ کی نکہتوں نے جسم و جاں میں بس کر کنیڈا کی فکری توانائیوں سے جلا پائی ہو تو اس مجسم کو طلسمی نہیں تو کیا ہونا چاہئے تھا۔ مشاعرہ کے اسٹیج پر ہوتا تو ایک باوقار خوش فکر شاعر دکھائی دیتا، داستان گوئی کے روایتی لباس میں لکھنو کا بانکا نظر آتا تو لوگ بے اختیار تالیوں سے استقبال کرتے۔ یہ وہ جاوید دانش ہے جس کی ہمسفری ہمیں دو ہفتے میسر رہی ہجرتوں کی جو داستان جاوید دانش نے پیش کی وہ ہندوستان میں رہنے بسنے والوں کے لئے بہت رقت انگیز اور دلوں کو چھو لینے والی تو تھی کیونکہ وطن عزیز میں شاید ہی کوئی گھر بچا ہو جس کے کوئی عزیز کسی نہ کسی بیرونی ملکوں کی سیر نہ کر چکے ہوں یا وہاں مقیم نہ ہوں۔ اور ہم غریب الوطنوں کے لئے اس قسم کی داستان گوئی ایک نیا تجربہ تھی ہمیں پتہ چلا کہ اس طرح بھی ہم اپنے مسئلے بیان کر سکتے ہیں، جاوید دانش جب برف کی چٹانوں پر مہاجروں کے گھوڑے دوڑا رہے تھے تو ہمیں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گھوڑے برف کی چٹانوں پر نہیں خلیج کے ریگزاروں میں دوڑ رہے ہیں جب یوپی سے کینڈا پہنچے روٹی بنانے والے کی کہانی سنا رہے

تھے تو لگ رہا تھا کہ ایسی بے شمار کہانیاں تو ہمارے آس پاس بھی سانس لے رہی ہیں بلکہ سسک رہی ہیں، تڑپ رہی ہیں۔ جب وہ بمبئی کے بھائی کی زبانی اس کی بے بسی بیان کر رہے تھے تو ہمیں لگا کہ کتنے بہت اونچی آواز میں بولنے والے دادا لوگ خلیجی ملکوں کو آ کر بے زبان ہو جاتے ہیں۔ داستان ختم ہوئی تو لوگ اپنی آنکھوں کے کناروں کی نمی کو صاف کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

داستان گوئی کے بعد غزل کا پروگرام پیش کیا گیا جس میں پہلے تو ایک نوسکھے نوجوان نے گانا شروع کیا جس کی بے ہنگم آواز کے ساتھ بہت بلند و بانگ موسیقی نے ہمیں مجلس سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ دیر دور ٹھہرنے کے بعد ایک سریلی سی آواز نے ہمیں پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا، جس نوجوان کو اپنی محبتوں کے حصار میں لئے ارتضی کریم اسٹیج کی جانب بڑھ رہے تھے وہ محفل میں قدم رکھتے ہی اپنی آواز کا جادو جگانے لگا تھا۔ ہمیں موسیقی سے نہ جانے کیوں کوئی دلچسپی کبھی نہ رہی اس لئے اس قسم محفلوں سے اجتناب رہا۔

مذہبی اور عقائد کے نقطہ نظر سے وسیلہ اور واسطہ کوئی مانتا ہے کوئی نہیں مانتا مگر دینی امور سے ہٹ جائیں تو سارا عالم ہی واسطوں اور وسیلوں کا قائل ہے، ہمارے یہاں تو اس کو ''وٹامن واؤ'' کہا جاتا ہے، اس وٹامن میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ دراصل اس تمہید کی ضرورت یوں پیش آئی کہ مہتاب قدر چالیس برس سے سعودی عرب میں اردو کی آبیاری کر رہا تھا، کسی کی چشم التفات اس پر نہ پڑی مگر جب سے برادر عزیز شہاب الدین سے واسطہ پڑا ہے ان کی شخصیت اور نگاہ گوہر شناس نے لوگوں کا انتخاب شروع کیا جس کی بدولت ہمیں بھی قومی کونسل کی عالمی اردو کانفرنس میں دو دفعہ شرکت کی دعوت ملی، پہلی بار تو ہم اپنے نامساعد حالات کے سبب نہ جا سکے مگر دوسری مرتبہ یہ فضیلت سر چڑھ ہی گئی۔ کانفرنس کی روداد آگے بڑھانے سے پہلے اچھا لگے گا کہ میں اس مخلص انسان کے بارے میں کچھ کہوں جو مجھے اپنا بڑا بھائی کہتا ہے اگرچہ کہ مجھ سے ان کا کوئی نسبی رشتہ نہیں ہے میں یہ بات اس لئے بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج کل کسی پر بھی اقربا پروری کے الزامات آسانی سے لگا دیے جاتے ہیں۔ یہی صورت حال ارتضی کریم صاحب کو بھی درپیش رہی ہے جبکہ شہاب الدین سے تو خلیجی حوالوں سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے مگر ارتضی کریم کو تو ہم نے خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ خیر آیئے کچھ باتیں برادر شہاب الدین احمد کے بارے میں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

شہاب الدین احمد دیکھنے میں ایک سیدھا سادہ سا انسان انکسار اتنا کہ دیکھنے والے کو اس کی تہی دامنی کا گمان ہونے لگے، خاندانی روایتوں کا امین مسکراہٹ لبوں پر سجائے پہلی بار ملا تو نظر میں کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکا۔ جدہ کے پروگرام میں شرکت کی اور اپنا مقالہ ایسے پڑھا جیسے بچے سبق پڑھتے ہوں۔ یہ احساس سفر کے دوران ہوا کہ اس کی جلد بازی میں ایک لمبے چوڑے ایجنڈے کا ہاتھ ہے جسے وہ اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں سرانجام دینا چاہتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شہاب الدین کسی معمر شخصیت کا نام ہے جوانی کی بھرپور توانیوں سے لبریز ایک انسان جو اردو کے لئے اردو والوں کے لئے وہ کچھ کرنا چاہتا ہے جو اس کے پیش رو نہیں کر سکے۔ گمنام ادیبوں اور شاعروں کو دنیا سے متعارف کروانا، انکی خدمات کا اعتراف کرنا، کتابوں کی اشاعت کے ذریعے اردو دنیا میں تہلکہ مچا دینا شہاب الدین جیسے سیماب صفت دوست کی خصوصیات میں داخل ہے۔ ہمیشہ ادھر سے ادھر بھاگتے پھرنا ساتھیوں کی خدمت اور انکی ضرورتوں کا خیال، میں نے ایسا جنونی اردو کا خدمت گزار زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ایک طرف والد بزرگوار علیل اور دوسری جانب بچوں کو گھر پر چھوڑا اور قطر میں اپنی منصبی ذمہ داریوں کا بوجھ الگ اس کے باوجود پورے سفر میں ایک پارے کی

طرح متحرک نظر آتا رہا۔ ایک علمی وادبی خاندان کا پروردہ پیکر جس میں کبھی اپنے والد بزرگوار کی بردباری جھلکتی ہے تو کبھی اپنے ماموں پروفیسر صفدر امام قادری کی طرح کسر نفسی شاخ ثمردار ہونے کا اعلان کرتی ہے۔ اگر شہاب الدین کو ادبی نجیب الطرفین کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ننھیال اور دادھیال دونوں خاندانوں میں علمی وادبی شخصیات کے انبوہ لگے ہیں۔

افتتاحی تقریب میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے علاوہ چند اور بھی معروف قد اور شخصیات سے ملاقات ہوئی جن میں طنز ومزاح کے معروف نثر نگار محترم مجتبیٰ حسین بھی شامل تھے، یہ تینوں بھائی محبوب حسین جگر، مجتبیٰ حسین اوران کے تیسرے بھائی (دوملک ایک کہانی کے مصنف) ابراھیم جلیس جو زوال حیدرآباد یا حکومت ہند کے ساتھ انضمام دکن کے بعد پاکستان چلے گئے تھے، حیدرآباد کی ماضی قریب کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کے لئے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ حیدرآباد سے تشریف لانے والوں میں پروفیسر بیگ احساس اور پروفیسر حبیب نثار سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا، خواتین میں ڈاکٹر شاہانہ مریم شان حیدرآباد یونیورسٹی کی ہونہار اسکالر جو حیدرآباد سے بیاہ کر دہلی آ گئی ہیں ملیں تو ساتھ ہی ان کے دہلوی شوہر سے بھی ملاقات کروائی۔ ڈاکٹر قمر سرور سے بھی اسی پہلیدن ملاقات ہوئی، دراصل ان دونوں سے آن لائن رابطہ ادبی واٹساپ گروپوں میں عرصہ سے رہا ہے، ان کے علاوہ ڈاکٹر وسیم راشد مدیرہ چوتھی دنیا سے بھی تعارف ہوا کہ شہلا نواب نے پہلے ہی میرا غائبانہ تعارف ان سے کروادیا تھا، جس کا ذکر محترمہ نے ملاقات پر فرمایا۔ امتیاز گورکھپوری بھی ملے اور اپنے رسالے کا تازہ شمارہ عنایت فرمایا۔ مجھے دلی کے اپنے دوستوں اور کرم فرماوں میں شاہین نظر اور عذرا نقوی نظر نہیں آئیں تو اندیشہ ہوا کہ کہیں انہیں دعوت نہ پہنچی ہو۔ ارتضی صاحب سے ذکر کیا، موصوف نے حقانی القاسمی سے جو اس افتتاحی تقریب میں استقبالیہ کمیٹی کے فعال ذمہ دار نظر آرہے تھے فون کروانے کو کہا سو از راہ کرم میری درخواست پر حقانی القاسمی نے انہیں دعوت بھی دی مگر دونوں شخصیتیں افتتاحی پروگرام میں نہ آسکیں بعد میں عذرا نقوی سے فون پر پتہ چلا کہ انہیں باقاعدہ دعوت نہیں پہنچی عذرا ریاض میں اپنے بہت محترم شوہر ڈاکٹر پرویز احمد کے ساتھ مقیم تھیں اور درس وتدریس کے علاوہ عذرا نقوی نے عربی کہانیوں کو اردو میں انگریزی ترجمہ کے ذریعے منتقل کرنے میں نمایاں کام کیا ہے ۲۰۰۸ کی جدہ میں عالمی اردو کانفرنس کے دوران ان سے ملاقات کا موقع ملا تھا کہ وہ اپنے مقالہ پڑھنے کے لئے ریاض سے ڈاکٹر پرویز کے ہمراہ تشریف لائیں اسی کانفرنس جہاں مجھے بھی اپنا مضمون پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تھا مولانا آزاد یونیورسٹی نے قونصل خانے کے تعاون سے منعقد کی تھی۔۔ اور شاہین نظر جو میرے جدہ کے قدیم کرم فرماوں میں ہیں اپنی تدریسی مصروفیات کے سبب نہیں آسکے۔ شاہین نظر تو پورے پروگرام میں نہیں آسکے البتہ بہن عذرا میری گزارش پر باقی پروگرام میں تشریف لے آئیں اور پھر آگے بہار وغیرہ میں بھی ان کا ساتھ نصیب رہا۔ بے باک صحافی عابد انور نے بھی شرف ملاقات بخشا۔ پروفیسر حسین الحق سے بھی نیاز حاصل ہوئے جن سے ملاقات کا شرف جدہ میں ان کی آمد پر نہ ہو سکا تھا اور دل میں اشتیاق باقی تھا، موصوف نے بہت محبت اور شفقت کا اظہار فرمایا۔

قارئین ذی احتشام آیئے اس کاروان کے سالار پروفیسر ارتضی کریم (ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) کے بارے میں کچھ عرض کروں صاحبو! مجھے ایسا لگا کہ سر کے بالوں کی سفیدی سے جسم کی ساخت کا کوئی میل جول نہیں ہے یعنی سر تو بزرگی کا اظہار کر رہا ہو اور چست، چاق و چوبند متحرک شخصیت اس

اظہار کے انکار پر مصر ہو، آنکھوں کی چمک فکر انگیزی کے ساتھ ساتھ تبحر علمی اور دانشوری کے اس پڑاو کا اعلان کرتی ہوئی کہ جہاں ایک قلمکار اپنے آپ سے مطمئن نظر آتا ہو چاہے زمانہ اسے مانے یا نہ مانے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو کی ترویج اور تشہیر کے لئے حکومت ہند کا سب سے بڑا ادارہ مانا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس بڑی ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھانا اور ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا اتنا آسان نہیں جتنا ان کے بہی خواہ سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں میرا ایک قدیم شعر عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ''میں مسافر ہوں خطائیں بھی ہوئی ہیں مجھ سے۔۔۔تم ترازو میں مرے پاوں کے چھالے رکھنا'' تیسری عالمی اردو کانفرنس 2016 کے دعوت نامہ کے ساتھ پروفیسر سید علی کریم بمعروف ارتضی کریم سے تعارف ہوا۔ برادرم شہاب الدین نے فون نمبر بھی ارسال کیا کہ انہیں فون کر کے آپ یعنی میں اپنی آمد کی توثیق کر دوں مشکل مراحل سے گزرتا ہوا میں جسے اپنے سفر کی سہولتوں کے ملنے کا امکان کم نظر آرہا تھا، یہ نہیں کر سکتا تھا جامعہ نے اگزٹ ری انٹری ویزا لگانے سے انکار کر دیا تھا، شعبہ کے مدیر کی سفارش بھی کام نہ آئی سو میں ارتضی صاحب کو صورت حال بتانا چاہتا تھا اسی لئے میں نے انہیں فون کیا۔ غالباً اس وقت ارتضی کریم صاحب کسی میٹنگ میں رہے ہوں گے کہ انہوں نے میرا فون اٹھا کر مختصر دو تین لفظوں میں بات مکمل کرتے ہوئے کہا'' آپ آجائیں آجائیں''۔ اس اختصار میں سرکاری افسری کے لہجیمیں چھپی اپنائیت کا بھی گمان ہو رہا تھا ویسے پورے سفر میں بھی اور سفر سے پہلے بھی یہ تجربہ ذہن میں جگہ بناتا رہا کہ ارتضی کریم صاحب فونوں کے معاملیمیں یا تو بہت مشغولیت کے سبب یا احتیاط کے تقاضوں کا خیال کرتے ہوئے کہ ان پر احباب پروری کا الزام آتا رہا ہے، گریز کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری کبھی ان سے یاری یا دعا سلام بھی نہ تھی، جس سے الزام لگانے والوں کی غلط بیانی کا یقین ہو جاتا ہے۔ ارتضی کریم اردو کی خدمت کے لئے اتنے ہی مخلص ہیں جتنی خود اردو (اردو والے نہیں) اپنی حفاظت اور ترویج وتشہیر کے لئے ہو سکتی ہے۔ ان لمحوں نے مجھے حیرت زدہ کر دیا جس دم ارتضی کریم نے جدہ میں اردو کی بے بسی اور اردو والوں سے اردو کی شکایات کا ذکر کرتے ہوئے میرا شعر پڑھا،

''اپنوں نے ہی مجھ کو نظر انداز کیا ہے
اردو کا میں شاعر ہوں اور اردو کی طرح ہوں''

اس سے یہ عقدہ کھلا کہ موصوف خلیج میں اردو کے منظر نامے پر گہری نظر رکھتے ہیں یا جس کو کانفرنس میں دعوت دیتے ہیں اس کے استحقاق کی تحقیق بھی کر لیتے ہیں۔

دوسرے دن کا پروگرام دہلی کے مشہور کانفرنس ہال اسکوپ میں منعقد ہونا تھا، سو وہاں پہنچے تو ایک گروپ کسی اخبار کی سرخیوں پر چہ مگوئیاں کر رہا تھا سرخی کچھ یوں تھی'' قومی کونسل کے پروگرام کا آغاز کانفرنس پر کاش جوڈیکر کے ہاتھوں افتتاح سے محروم'' یہ کوئی نئی بات نہیں کہ بیمار ذہن اور زرد صحافت کے امین ہمیشہ مثبت کو بھی منفی بنا کر پیش کرنے میں جری ہوتے ہیں اور خود ہی اپنی جراتوں کے باعث خوار بھی ہوتے ہیں۔ مرکزی وزیر کی عدم شرکت کی وجوہات کونسل سے عدم دلچسپی ہرگز نہیں تھی جس کو ہر ذی فہم شخص سمجھ سکتا ہے، بلکہ حکمران پارٹی کو درپیش مراحل میں ان کا رہنا زیادہ ضروری تھا، سو وہی ہوا اس کا اظہار وزیر موصوف نے تیسرے روز اپنی شرکت اور یادگاری تحفے اور شہادت ناموں کی تقسیم کے موقع پر فرما بھی دیا۔

بیرونی مندوبین میں عموماً ساتھی اشوکا ہوٹل میں مقیم تھے اور وہیں سے اگلے دو دن اسکوپ سنٹر جانا آنا رہا۔ البتہ فرزانہ لطفی (تہران) وغیرہ اپنی پسند کے رہائش گاہوں میں مقیم رہے۔

دوسرے اور تیسرے دن اپنے مقالے پیش کرنے والے مہمانوں میں خاکسار کے علاوہ،شہاب الدین احمد، فہیم اختر انگلینڈ، احمد اشفاق قطر، وفا یزدان وفرزانہ لطفی تہران، ترکی کے سائی ناتھ چاپلے، رجب درگن، خاقان قیوم بھی شامل تھے۔

آیئے اب چند اور خوبصورت شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

وفا یزدان منش (تہران) تہران سے کانفرنس میں شرکت کرنے والیوں میں وفا یزدان منش کے علاوہ فرزانہ لطفی اور رسرچ اسکالر زینب سعیدی بھی تھیں مگر ہمارے ساتھ دہلی سے کلکتہ تک سفر حضر میں ساتھ رہنے والی بیرونی مندوب صرف ڈاکٹر وفا یزداں منش (تہران یونیورسٹی میں اردو کی پروفیسر) تھیں، کسی بھی ایرانی خاتون سے ہماری یہ پہلی ملاقات تھی۔ جب وہ فارسی آمیز لہجے میں اردو بولتیں تو سامعین تو دلچسپی سے سنتے ہی، خواص یعنی ساتھی قلمکار و منتظمین بھی ''تجھ کو دیکھیں کہ تجھ سے بات کریں'' کے مصداق ایسے محو ہو جاتے کہ گویا کسی آبشار کے گرنے کا حسین منظر دیکھ رہے ہوں۔ یا زبان حال سے کہہ رہے ہوں،

''وہ جب بولے تو جادو بولتا ہے۔۔۔مرا محبوب اردو بولتا ہے''

وفا یزدان کا قلمی سفر شعر سے زیادہ نثر میں رہا ہے اور اردو کی ترویج میں تہران کے ادبی حلقوں میں انکی خدمات قابل ستائش ہیں۔ عالمی کانفرنس میں غالبا ان کی دوسری بار شرکت تھی اس کا اندازہ بہار اردو اکاڈمی میں گزشتہ برس کے پروگرام کی تصاویر دیکھ کر ہوا جس میں وفا یزدان کی تصویر بھی نظر آرہی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وفا اُس تصویر میں زیادہ بنی ٹھنی نظر آرہی ہیں جب کہ انہیں کسی بھی طرح سنورنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں کہ فطری حسن سادگی میں اچھا لگتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز ارشد نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا بھی کہ کیا یہی وفا یزدان ہیں جو گزشتہ پروگرام میں شریک تھیں اس استفسار نے وفا پر تھوڑا بہت اثر ضرور کیا ہوگا کہ اس کے بعد والی ملاقات میں محترمہ قدرے مختلف نظر آئیں کہ غازہ وغیرہ سے نوک پلک درست کر رکھے تھے۔ ہمارے ایک قدیم دوست کا شعر ہے، عظیم لوگوں کی عظمت ہے سادگی میں نہاں، رنگوں کی شوخی ونقش نگار کچھ بھی نہیں۔ بہرطور وفا یزدان منش اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ درویشانہ مزاج کی خاتون لگیں، جسے علم ودانش سے (دانش سے میری مراد جاوید دانش نہیں ہے) خاصا شغف وتعلق ہے۔ ذکر اس پری وش کا۔۔۔

اسی طرح صدف اقبال بھی اپنے جنتی شوہر کے ساتھ ہمارے پورے سفر میں ہمسفری کے طور طریقے نبھاتی یعنی تقریبات نشست وگفتگو طعام وغیرہ میں ساتھ رہیں۔ بہت مخلص جواں سال شاعرہ افتتاحی اجلاس میں پہلی ملاقات ہوئی تو انکی والہانہ محبت نے بہت متاثر کیا۔ فوراً ہی اپنے شوہر کے کیمرے سے ہمارے ساتھ تصویریں بنوائیں۔ زندہ دلی کے حصار میں قید صدف اقبال سے حیدرآباد میں ملاقات نہ ہوسکی تھی جہاں وہ ایک مشاعرہ اور علی نثار کی صاحبزادی کی شادی میں شرکت کے لئے آئی تھیں، اس عدم ملاقات کا دونوں کو قلق تھا سو دہلی میں یہ آرزو پوری ہوئی۔ صدف اقبال نثر ونظم دونوں میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔ ساتھ تصویریں بنوانے والی یہ پہلی فرد نہ تھی بلکہ غالب اکیڈیمی میں دہلی کے نامور شعرا وشاعرات کے ساتھ اجتماعی تصویر کے علاوہ بھی دو چار تصویریں مینا خان، شہلا نواب اور دیگر حضرات کے ستھ بنی تھیں۔ یہ سب بہت ضروری بھی ہوتا ہیکہ اس کے بغیر آدمی غالب کا طرح یہ کیسے کہہ سکتا ہے، چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط۔ اور تھوڑی بہت آوارگی تو اس کے بغیر مکمل بھی نہیں ہوتی۔

OOO

سلسلہ جاری

مضمون

مہدی جعفر

اسرار گاندھی اور تانیثی زاویہ

نام اسرار احمد مگر تحریر میں عموماً سریت نام کو نہیں۔ زندگی میں گھر بار سنوارنا اور تنہائی میں کہانیاں تخلیق کرنا۔ شہر کا گوشہ گوشہ انہیں جانتا پہچانتا ہے۔ روح پارہ صفت اور شخصیت اظہر من الشّمس۔ جب پڑھنے اترے تو اس شدت کے ساتھ کہ جلد ہی چشمہ آنکھوں پر چڑھ گیا۔ چہرے مہرے سے گاندھی جی کی شباہت ٹپکتی تھی، پھر ویسی ہی عینک۔ لوگ انہیں اسرار گاندھی کے نام سے پکارنے لگے۔ زبان خلق ونقارۂ خدا جان کر اسی نام کو اختیار کیا۔

پڑھاتے انگریزی ہیں لکھتے ہیں اردو اور ہندی میں۔ چنانچہ مادری زبان اردو ان کی پروفیشنل فیلڈ سے باہر ہے۔ گھر میں جم کر بیٹھ نہیں سکتے۔ ملیں گے تو کسی سڑک پر ایک عدد اسکوٹر کے ساتھ یا کسی دوست کے یہاں یا کافی ہاؤس میں۔ مگر وہاں بھی کچھ دیر تک ٹھہرنا دوبھر ہے۔ گورے رنگ، میانہ قد اور بھرے بھرے جسم کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا کہ عمر عزیزی نصف صدی چار پانچ سال پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ انہیں دیکھنے والا کسی زاویہ سے کہانی کار نہ مانے گا۔ یہ ہیں جنوری دو ہزار تین کے اسرار گاندھی جنہوں نے ''ہڈیاں'' اور ''رہائی'' جیسی اچھوتی کہانیاں تحریر کر ڈالیں۔

میں نے اٹھارہ بیس برس پہلے انہیں الہ آباد میں کہانی سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر وقت تیزی سے گزر گیا۔ اس دوران اسرار گاندھی کا حلیہ ذہن سے اس قدر محو ہو گیا تھا کہ اب پھر یہاں آیا تو ایک جلسہ میں نعیم اشفاق (جنہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا) کو اسرار گاندھی سمجھ بیٹھا۔ انہوں نے بتایا کہ اسرار گاندھی وہ دیکھئے وہاں بیٹھے ہیں۔ اسرار گاندھی کو سمجھنے اور انہیں کہانی کار سمجھنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ ایک تو ان کے پیروں میں پارہ بھرا ہوا ہے دوسرے ان کی پارہ پارہ گفتگو کو جوڑنا پڑتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ بتایا مختصراً یوں ہے:

> ''کہانیاں وہی زندہ رہیں گی جو ٹائم اسپیس کو پار کر جاتی ہیں۔ اردو ادب میں کفن، ہتک ٹوبہ ٹیک سنگھ، گڈریا اور ببل ایسی ہی کہانیاں ہیں جو پورے طور پر مکمل ہیں۔ میں جب تخلیقی پراسیس سے گزرتا ہوں تو کہانی کو اس کے فطری بہاؤ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ کسی قسم کی شعوری چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا۔ ہاں زبان کو اچھی رکھنے کی شعوری کوشش ضرور کرتا ہوں۔ تمام کہانیاں اپنی فطری بناوٹ لے کر خود آتی ہیں۔ کہانی کی بناوٹ کو لے کر کسی طرح کی حسی یا معاشرتی نقطۂ نظر کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے لیے طویل کہانی کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے آپ کسی ربڑ کو کچھ زیادہ ہی کھینچ دیں تو ربڑ میں شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ چھوٹی کہانیاں رائفل کی گولی کی طرح کام کرتی ہیں۔ میں نے اب تک جنس کے موضوع پر صرف ایک کہانی ''ہڈیاں'' لکھی ہے۔ باقی جو بھی ہے Off-Shoot کے طور پر ہے۔ مجھے اپنی کہانی ''ایک جھوٹی کہانی کا سچ'' بہت پسند ہے۔ یہ کہانی عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی منافقت پر لکھی گئی ہے۔''

اسرار گاندھی کو جو کیفیت کہانی لکھنے پر مجبور کرتی ہے اس میں ان کی دالی شخصیت کا اتنا عمل وخل نہیں ہے جتنا کہ ان کے مشاہدے کا ہے۔ان کی تیزی سے پڑتی ہوئی نگاہ میں معاشرہ بھی آتا ہے اور فرد اطبعی رویہ بھی۔کبھی کبھی یہ نظر سرعت سے نظریے کے چہرے پر گردش کرنے لگی ہے۔(وہ جو راستے میں کھوئی گئی بے بسی)۔ وہ خود اپنے آپ سے مختلف اور متفرق صورتوں، ان کی حرکات وسکنات کا نہ صرف دھاردار جائزہ لیتے ہیں بلکہ اپنی کہانیوں کی راہ سے ان پر تنقید بھی کرتے ہیں۔اس کی اچھی مثال ''نالی میں اُگے ہوئے پودے'' فراہم کرتی ہے۔ان کے لیے خود اپنے آپ سے مغائرت صورت کی بہترین نمائندگی، عورت کے کردار کے علاوہ کون کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً ان کی کہانیوں میں عورت یا تو مرکزی ہوتی ہے یا وہ کہانی کی ساخت میں اہم رول ادا کرتی ہے۔اس کے وجودی احساس کو تندو تیز کرنے کے لئے اکثر وہ جنسی سلوک کا سہارا لیتے ہیں۔''گئو دھول'' لکھنے والے ان کے استاد پروفیسر عقیل کا خیال یوں ہے :

> ''اسرار گاندھی کی کہانیوں کا ایک ڈائمنشن جنسیات بھی ہے۔ان کی اکثر کہانیوں میں یہ ڈائمنشن ایک خاص ڈھنگ سے ابھرتا ہے۔ ادب میں یہ مسئلے خاصے نازک ہوتے ہیں اور اگر انہیں مہارت کے ساتھ گرفت میں نہ لیا جائے تو اس میں رسوائی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ جہاں ادیب یا تو ''Pornographist'' ہو جاتا ہے یا پھر اسے بازاری تھیم ایک پھوہڑ کہانی کار بنا دیتا ہے۔تاہم اسرار گاندھی بھی ایسے تھیم میں بہت بچا کر قدم بڑھاتے ہیں اور اس راستے سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کی فکر کرتے ہیں۔''

''وہ جو راستے میں کھوگئی'' کا اسلوب تحریر ایسا ہے کہ اس میں عورت کی برہنگی کی صورت گری پر جنسی اشتعال انگیزی (Eroticism) کا لیبل نہیں لگ سکتا۔ یہاں عورت کا متغائر بدن ہے۔ غائب متکلم کے دل میں اس کا تماشا دیکھنے کی شدید خواہش جنم لیتی ہے۔ وہ اسے جس حال میں دیکھ پاتا ہے وہ ہے عورت کا وہ جسم جسے جبرے ہاتھوں نے ننگا کر کے ذلیل وخوار کیا ہے۔نظر اس کے چہرے پر دوڑتی ہے تو وہاں پر ایسا کرب مترشح ہوتا ہے جس نے تمام وکمال برہنگی پر مطلق شرم وحیا کا دبیز پردہ اڑھا دیا ہے۔ اسے دیکھ کر غائب متکلم احساس ندامت سے بے چین ہو جاتا ہے:

> ''سنٹی والے آدمی کے پیچھے موجود لوگوں میں ایک آدمی کے دونوں ہاتوں میں جھن جھنے تھے۔جنہیں وہ ایک ہی رفتار سے بجائے چلا جا رہا تھا باقی لوگ کلبیا پر آوازیں کس رہے تھے۔ کلبیا جس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے ایک ٹک آسمان کی جانب تکے جا رہی تھی۔ جب گردن اٹھائے اٹھائے دکھنے لگتی تو وہ گردن کو نیچے کر لیتی اور اس کی نظریں آسمان سے زمین پر اتر آتیں۔اس کی آنکھوں میں شرم خوف، دہشت، مجبوری، اذیت اور بے بسی کی پرچھائیں ناچ رہی تھی۔ اسے کلبیا کو سورج کی روشنی میں برہنہ دیکھنے والی اپنی خواہش پر اپنے آپ سے بڑی ندامت کا احساس ہوا۔ اسے لگا کہ جیسے اس کے کہیں کوئی کانٹا سا چبھ گیا ہو۔ایک عجیب بے چینی جیسے آہستہ آہستہ ان کا خون منجمد ہو رہا

ہو۔''

مصنف اخلاقی قدر کی گراوٹ اور اس سے متعلق عورت کی شرمساری معلوم ومنکشف کرتا ہے۔ یہاں جنسیت پسندی (Eroticism) کی قطعی گنجائش نہیں۔

یہ کہانی کچھ پہلے کا واقعہ بیان کرتی ہے۔ یہ وقت گزر گیا۔اب اس کا تقابل آج کے اس جبر خیز جنسیاتی واقعہ سے کیجیے۔ کس پاگل کے لیے یہ واقعہ Erotic ہوگا جس کی صنعت کرنے والے انسانی احساس کی پرتوں بھری کچکچاہٹ اور ہیجان کے درمیاں بیانیہ عمل اور ردعمل اس طرح خلق کیا گیا ہے اور یہ افسانہ اس طرح نمو پذیر ہوا ہے کہ قاری کے لئے جنسی ہیجان پیدا کرنے والا (Erotic) نہیں رہتا اور نہ جنسیاتی تحریک پیدا کرنے والی تحریروں کی پکڑ میں آتا ہے۔مصنف نے بیانیہ خلق کرتے ہوئے جن پیکروں کا التزام کیا ہے ان کی بنت اور بافت دلچسپ بیانیہ تشکیل کرتی ہے۔''ہڈیاں'' نسائی ادب کی اچھی مثال ہے۔

''ایک جھوٹی کہانی کا سچ'' دو سیکس ورکرس کی پیشہ ورانہ زندگی کا آئینہ ہے۔اس میں متوازی انداز میں ایک مرد اور ایک عورت کا کردار برتا گیا ہے۔تکنیکی اعتبار سے کہانی کا زیادہ تر حصہ مرد کی زندگی پر مشتمل ہے اور عورت بعد میں داخل ہوتی ہے۔دونوں ایک دوسرے سے دوستانہ مراسم رکھتے ہیں۔وہ وقت بھی آتا ہے جب وہ اپنی تجارتی جنسیت سے تھک کر چور ہوجاتے ہیں۔ایک روز عورت مرد کے ٹھکانے پر آتی ہے۔دونوں گھلی ملی باتیں کرتے ہیں۔عورت ضرورت کے لحاظ سے باتوں ہی باتوں میں مرد سے پیش کش کرتی ہے کہ کیوں نہ ساتھ مل کر گھر بسالیں تو مرد کے 'مرد پن' والا رویہ عورت کے 'عورت پن' کے سامنے کتنا ہیچ نظر آتا ہے :

''اگر ایسا ہی ہے تو میرے ساتھ مل کر گھر کیوں نہیں بسا لیتے''

''نہیں یہی تو نہیں ہوسکتا۔''

''کیوں نہیں ہوسکتا۔''

''دیکھو جنی میں اب ایک صاف ستھری اور اچھی زندگی گزارنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی زندگی سے میں تھک چکا ہوں۔ پھر تم خود ہی سوچو کہ کیا میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کرسکتا ہوں۔جس کا ماضی اس کے حال سے الگ نہ کیا جاسکے۔''

یہ تم کہہ رہے ہو؟ یا تم نے کبھی آئینہ نہیں دیکھا؟

''میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ مجھ میں اور تم میں ایک بنیادی فرق ہے۔'''' اور وہ فرق عورت ہونے اور نہ ہونے کا ہے۔ جنی کے لہجے میں کانٹوں کی چبھن تھی۔''

''ہاں جنی تم ٹھیک سمجھیں کہ یہی سچائی ہے۔''

''جنی کچھ نہ بولی۔صرف اسے غور سے دیکھتی رہی۔اچانک اسے نلنی یاد آ گئی۔کتنی للک تھی اسے ایک اچھی زندگی جینے کی۔ کتنے خواب دیکھے تھے اس نے۔لیکن کیا وہ اس کیچڑ بھری زندگی سے۔۔''

جنی کی آنکھیں دھندلا گئیں اور اگلے لمحے سامنے کھڑے ہوئے موہن کا چہرہ لہوترا ہوکر زمین پر ٹپک پڑا۔تکنیکی اعتبار سے پوری کہانی میں مرد کا زاویہ نظر جاری وساری ہے۔مگر آخر میں بیانیہ عورت کے زاویہ نظر میں بدل جاتا ہے۔اسی جگہ سے قاری مرد کی اوچھی طبیعت والی جنسی نفسیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

عورت کی مرد کی فطرت سے جداگانہ تشکیل کی صاف

پہچان ''رہائی'' کے ذریعے ہوتی ہے جہاں وہ اپنی الگ حیثیت رکھتی ہے۔عنوان رہائی خود اس افتراق کا غماز ہے۔ یہ کہانی آج کے بدلتے ہوئے یا شاید بدلے ہوئے نسوانی معاشرتی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ یہاں عورت کے متغیر روپ کے ساتھ عصری معاشرہ کا وہ چہرہ نمایاں ہے جو تغلیب نسواں کے سامنے خود اپنے آپ کو بدلنے پر مجبور ہے۔ غالباً یہ کہانی ایسے معاشرتی مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے جو لگتا ہے بہت دور نہیں جہاں عورت کا وجود شاید ازلی شکل میں طلوع (Evolve) ہو رہا ہے۔ایسا ہوا تو یہ آج کے متنوع انداز حیات پر فطرت کی فتح ہوگی۔

''رہائی'' بنیادی طور پر ایک تانیثی کہانی ہے جس میں سادہ بیانی سے کام لیا گیا ہے۔''ہڈیاں'' کی طرح یہ گھر کے اندر کی (Indoor) کہانی نہیں ہے بلکہ سارا معاشرہ باہر (Out door) کی حیثیت سے شامل ہو کر عمل اور ردعمل کرتا ہے۔ یہ شمولیت پر تجسس خبروں (جن میں لوگوں کے درمیاں پھیلنے پھیلانے والی افواہوں کی سی شدت ہے) ہر ٹریٹمنٹ سے اجاگر ہوئی ہے۔اس شمولیت میں چہ می گوئیوں کا سلوک ہے جو لوگوں کے درمیان الگ سے دکھائی دیتا ہے، دوسری طرف عورت کی ابتلا کا سلوک ہے جسے الگ سے فلیش بیک اور یادوں کی تکنیک کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ ''ہڈیاں'' اور ''رہائی'' میں ایک بات مشترک ہے وہ یہ کہ ان میں جو تجربے (Experiences) برتے گئے ہیں وہ مصنف کے اپنے ذاتی تجربے نہیں ہو سکتے بلکہ محسوس ادراک اور مشاہدے کو فنی طور پر منتقل کرنے کے تجربے ہیں۔ یہ کہانی قاری کے لئے 'رہائی' ہے خود مصنف کے لیے پیکر محسوس ہے۔ مصنف جس فن پارے میں ذاتی طور پر شامل نہیں ہوتا اس کی تعین قدر اپنے آپ کرنا ذرا دشوار ہوتا ہے۔'رہائی' کی مقبولیت کے سلسلے میں اسرار گاندھی کہتے ہیں :

''مجھے اس پر حیرت تھی جب کہ میں اپنی بعض دوسری کہانیوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ مثلاً 'ایک جھوٹی کہانی کا سچ'، 'وہ جو راستے میں کھو گئی'، یا پھر 'نال میں اگے ہوئے پودے'۔ آپ نے 'رہائی' کا ذکر کیا تو میں چونکا۔'رہائی' لکھتے وقت یہ کبھی احساس نہیں تھا کہ ایک ایسی کہانی بن جائے گی جسے مختلف بڑے جریدے شائع کر دیں گے۔سب سے پہلے 'ذہن جدید' اس کے بعد 'روشنائی' اور 'ارتقا' نے اس کہانی کو شائع کیا۔ بعد ازاں عالمی اردو ادب نے جب ۲۰۰۱ء کا انتخاب شائع کیا تو یہ کہانی موجود تھی۔ یہ کہانی میرا ذاتی تجربہ نہیں تھا بلکہ ایک Social observation تھا۔''

''رہائی'' بدلاؤ کی کہانی ہے۔ کیا ہمارا فرد اور ہمارا معاشرہ ایسی کگار پر نہیں کھڑا ہوا ہے جہاں کیمیائی تبدیلی کی طرح واپسی کے امکانات نہیں ہیں؟ کیا نئی عورت کی سوچ معاشرے کے بالمقابل بہت مختلف ہے؟ کیا نئی نسل کی عورت میں ردعمل کی جرأت پہلے سے کہیں زیادہ ہے؟ عورت کا معاشرتی مستقبل کیا ہے؟ کیا نئی نسل کی عورت طے کر چکی ہے کہ مذہبیت اور اخلاقی قدریں صرف و محض پہلے والوں کی شناخت ہے؟ عزت کیا ہے اور اس کی بنیاد کیا ہے؟ عورت کو عزت کے ساتھ کیوں باندھا گیا ہے؟ کیا وہ اسی سے رہائی چاہتی ہے؟ ان جملوں کا اشارہ دیکھیے :

(۱) بیٹی یہ عالیہ کی گردن نہیں تھی بلکہ وقت کے پھندے میں پھنسی عورت کی گردن تھی۔

(۲) شاید اب وقت کی گردن عورت کے پھندے میں پھنس چکی ہے۔

(۳) برآمدہ پار کرتے ہوئے (بڑے صاحب)

دھیرے سے بڑبڑائے۔ ''خدا کا شکر ہے کہ عطیہ کسی ہندو کے ساتھ نہیں بھاگی۔''

اس آخری جملے میں بلا کا طنز ہے جو خنجر کی طرح دل کے پار ہو جاتا ہے۔ اس میں بہلاوا بھی ہے۔ صورت حال بھی ہے اور حالات سے سمجھوتا کرنے کی شدید کوشش بھی۔ اس میں ہتھیار ڈال دینے والی شکست کا اعتراف ہے۔

اسرار گاندھی نے اب تک چھوٹی کہانیاں ہی لکھی ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے بے حد جداگانہ ہوتی ہیں۔ تھیم کے اعتبار سے بھی اور تکنیک کے طور پر بھی۔ بیس پچیس سالوں میں انہوں نے بس اتنی ہی کہانیاں لکھی ہیں کہ انگلیوں پر گن لی جائیں۔ جی چاہتا ہے کہ وہ ذرا بڑا ربڑ اٹھالیں اور صرف اتنا ہی کھینچیں کہ شکن نہ آئے۔ مثلاً ''ہڈیاں'' میں کچھ بڑے 'ربڑ' کی ضرورت تھی۔ یوں سمجھئے کہ اگر کہانی کو پلٹ دیا جائے اور مرد کا زاویہ اختیار کیا جائے، دادی ماں کی جگہ دادا ہوں اور دوسرے مخالف پیکری لوازم داخل کئے جائیں عورت کی جگہ مرد ہو اور افسانہ تذکیری ہو تو بھی کہانی وہیں کی وہیں رہتی ہے سوائے ہڈیوں کے ردعمل کے۔ عورت کا زاویہ تو بن گیا ہے عورت کا اپنا مختلف رویہ بہت نمایاں نہیں ہوا۔ بہ ایں ہمہ کہانی قابل ذکر ہے۔

میری شخصی رائے ہے کہ عصرِ حاضر کے اگر پانچ بڑے افسانہ نگاروں کی کوئی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں بیگ احساس کا نام ضرور شامل رہے گا۔ وہ نہایت مخلص، سچے اور ایماندار افسانہ نگار ہیں۔ مجتبیٰ حسین

بیگ احساس

کے

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

مضمون

آمنہ تحسین

اولوالعزم خاتون جمال النساء۔ایک تعارف (یاداشت ''بکھری یادیں'' کے حوالے سے)

جمال النساء (پیدائش۔ حیدرآباد'۱۹۱۳ء ، وفات ۲۰۱۲ء)'علمی و ادبی ذوق کی حامل' سیاسی و سماجی شعور رکھنے والی فعال ونہایت بہادراور باحوصلہ خاتون تھیں۔وہ ''باجی جمال النساء'' کے نام سے جانے جاتی تھیں۔انھوں نے اپنی طویل زندگی کا ایک بڑا حصّہ نہ صرف خواتین کی ترقی و بااختیاری کے لیے وقف کر دیا تھا بلکہ کئی برس سیاسی سرگرمیوں کی نذر کر دیے تھے اور قائدانہ رول نبھایا تھا۔اگر چیکہ ادبی میدان میں ان کی خدمات زیادہ نہیں رہیں لیکن ان کی تحریر کردہ صرف ایک تصنیف ''بکھری یادیں'' جمال النساء کی ادبی لیاقت کو منوانے نیز اس کتاب کی سماجی و سیاسی اور تہذیبی اہمیت کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے کافی ہے۔مختلف شعبہ ہائے حیات میں جمال النساء کی بھر پور حصّہ داریوں کے باوجود صرف معدودے چند افراد ہی ان کی شخصیت اور کارناموں سے واقف ہیں جب کہ ان کی فعال زندگی کے تقریباً تمام گوشے گمنامی کی نذر ہیں۔

جمال النساء کمیونسٹ پارٹی کی رکن تھیں۔حیدرآباد میں اس تنظیم کی تمام تر سرگرمیوں میں انھوں نے ایک عرصہ دراز تک نہایت اہم اور قائدانہ رول نبھایا تھا۔وہ بایاں بازو کے سیاسی نظریات سے بے حد متاثر تھیں۔انھوں نے اس دور کے ممتاز جہد کار،ترقی پسند مصنفین وقومی لیڈران اور کامریڈز جیسے راج بہادر گوڑ ،مخدوم محی الدین ،قاضی عبدالغفار وغیرہ کے ساتھ ملکر آزادی ہندو تلنگانہ تحریک میں بے شمار انقلابی کام انجام دیے تھے۔ان کے بھائی اختر حسن،رابعہ برنی اور ڈاکٹر رضیہ اکبر بھی اسی تحریک کے سر گرم کارکن تھے۔

ریاستِ حیدرآباد میں آصف جاہی سلطنت کی مستحکم حکومت کی بناء پر انگریزوں کے تسلط سے ہندوستان کی آزادی کی کوششوں اور تحریکوں کا اگر چیکہ بظاہر زیادہ اثر نہیں ہو پایا تھا جتنا کہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں یا شہروں میں ہوا تھا۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خفیہ طور پر حیدرآباد میں بھی ایسے کئی حامیان تیار ہو گئے تھے جو قومی نظریہ کے تحت نہ صرف انگریزوں کے تسلط بلکہ صدیوں سے چلے آرہے شاہی وجاگیردارانہ نظام سے بھی ملک کی آزادی کے متمنی تھے۔ان میں بڑی تعداد کمیونسٹ نظریات وعوامی حکومت کے حامی افراد کی تھی۔اس حقیقت سے بھی تقریباً سب ہی ہندوستانی واقف ہیں کہ جنگِ آزادی دو محاذوں پر لڑی گئی۔ایک طرف گاندھی جی کے عدم تشدد والے نظریات کے حامی آزادی کے متوالے تھے تو دوسری طرف متوازی طور پر ہندوستان کی آزادی کو لے کر بایاں بازو کی پر جوش وسرخ انقلاب کی تحریک بھی زوروں پر تھی اور بہت سے افراد اس تحریک سے وابستہ ہو رہے تھے جن میں مختلف شعبوں سے وابستہ افراد کے علاوہ ادباء وشعراء بھی شامل تھے۔اسی دوراں ہندوستان میں ''ترقی پسند مصنفین'' کے قیام نے زبان و ادب کے ذریعہ سماجی حقائق کی عکاسی کے

(۲)

ساتھ ساتھ بایاں بازو کے نظریات کو بھی خوب فروغ دیا۔''ترقی پسند مصنفین'' کے کارواں میں ہر دن اردو کے بشمول تقریباً ہندوستانی زبانوں کے اہلِ قلم افراد کی شمولیت ہوتی رہی اور وہ کارواں بڑی تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔حب الوطنی اور آزادی کے جوش سے بھر پور تحریریں وجود میں آتی گئیں۔قومی سطح پر سیاسی،سماجی اور ادبی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات کہیں نہ کہیں حیدرآباد کے معاشرے پر بھی مرتب ہوتے رہے۔لہذا انگریزوں سے ملک کی آزادی اور جاگیردارانہ نظام کی مخالفت میں دھیرے دھیرے چند ایک افراد قومی تحریکوں اور مختلف تنظیموں سے وابستہ ہوتے گئے۔

ریاستِ حیدرآباد میں ملک کی آزادی کے نظریہ کو لے کر

تحریکات میں حصّہ لینے والوں میں مردوں کے مقابلے خواتین کی تعداد نہایت کم تھی۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حیدرآباد کے سخت روایتی وتہذیبی اور جاگیردارانہ ماحول میں اگرچیکہ خواتین کی تعلیم و ترقی کو لے کر مختلف سطحوں پر کوششیں شروع ہوگئی تھیں لیکن وہ تمام تر کوششیں مخصوص نظریات اور ہدایات کی پابند تھیں۔ایسے سماجی و تہذیبی ماحول میں ملک کی آزادی اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھانا یا اس نظامِ حکومت کی تبدیلی کی کوشش کرنا یا قومی سیاست کا حصّہ بننا خواتین بالخصوص مسلم خواتین کے لیے نہایت مشکل امر تھا۔یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد میں سیاسی سطح پر متحرک مسلم خواتین کی تعداد بالکل کم نظر آتی ہے۔ایسے ذہنی، سماجی و سیاسی بندشوں کے دور میں جمال النساء کمیونسٹ تنظیم کے ابتدائی دور سے ہی وابستہ ہوئیں اور مختلف سرگرمیوں میں نہایت فعال رہیں۔ انھوں نے ریاستِ حیدرآباد کی سماجی، سیاسی، ادبی وتہذیبی زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ملک کی آزادی (۱۹۴۷ء) اور سقوطِ ریاستِ حیدرآباد (۱۹۴۸ء) سے قبل کے سیاسی وسماجی حالات، پھر بعد میں رونما ہوئی تبدیلیوں کی وہ نہ صرف چشم دید گواہ تھیں بلکہ وہ خود بھی ایک اہم حصّہ تھیں۔حیدرآباد میں ان کا مکان مختلف سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا۔جہاں بے شمار سیاسی وادبی شخصیتوں نے مل کر اپنی فکر وخیال کو نہ صرف مہمیز کیا تھا بلکہ سماجی سطح پر بیداری و تبدیلیوں کے لیے سرگرم ماحول تیار کیا تھا۔آزادی ہند، سقوطِ حیدرآباد اور تلنگانہ تحریک کے دوراں ہتیار بند لڑائی کے لیے حکمت عملیوں کی تیاری، جہد کاروں کی روپوشیوں اور ہتیار کے ذخیرہ کے لیے جمال النساء کا مکان اہم مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ایک باحوصلہ وبہادر لیڈر کی طرح جمال النساء نے ان سب کارکردگیوں میں موثر رول ادا کیا تھا۔

جمال النساء کی کثیر الجہات شخصیت اور ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں سے ہم متعارف نہیں ہو پاتے اگر وہ خود اپنی زندگی اور اپنے عہد کی تمام تفصیلات کو رقم نہ کرتیں۔جمال النساء نے اپنی یادوں میں محفوظ بے شمار خاندانی، سماجی، ادبی وسیاسی واقعات کو ''بکھری یادیں'' کے عنوان سے تحریر کیا اور اسے کتابی شکل دی۔ جو ۲۰۰۸ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔جمال النساء نے اگرچیکہ اس کتاب کو ہئیت کے اعتبار سے ''یادداشت'' کا نام دیا ہے اور ذیلی عنوانات کے تحت مختلف حالات اور واقعات کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔لیکن ۲۴۳ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مصنفہ کی طویل زندگی کے شب وروز، ان کی ظاہری و باطنی شخصیت، حیدرآباد کی مکمل معاشرتی تاریخ، مختلف علاقوں کی تفصیلات، سیاسی وادبی سرگرمیوں کے علاوہ کئی ایک سیاسی وادبی شخصیتوں کی زندگیوں سے بھی بھرپور متعارف کرواتی ہے۔علاوہ ازیں اس کتاب کے ذریعہ دیگر ممالک کی سیاسی وسماجی اور تہذیبی تاریخ کے بھی اہم گوشوں سے ہمیں تعارف حاصل ہوتا ہے۔تاریخی اعتبار سے واقعات کا تسلسل اور بہتر انداز میں پیش کشی کی بناء پر یہ ''یاداشت'' ایک مکمل اور جامع خودنوشت سوانح معلوم ہوتی ہے۔جس میں نہ صرف

(۳)

قومی بلکہ ریاستِ حیدرآباد کی تاریخ وتہذیب کے کئی ایک پوشیدہ گوشے اور ان سنی داستانیں محفوظ ہوگئی ہیں۔

''یادداشت' (Memoir) ''دراصل جدید ادبی صنف ہے جو مغربی زبانوں کے ادب میں بہت مقبول ہے۔ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق ''یادداشت'' دراصل خودنوشت سوانح سے کچھ مختلف تحریر ہوتی ہے جس میں مصنف اپنے حالات وواقعات کو یادوں اور مشاہدات کی بنیاد پر مختلف عنوانات کے تحت مختصر طور پر تحریر کرتا ہے۔آپ بیتی، یاداشتیں، روز نامچے، خودنوشت سوانح عمری' غیر افسانوی ادب کی اہم ترین اصناف ہیں۔ان تحریروں کا شمار سوانحی ادب میں ہوتا ہے۔اس صنفِ ادب کے ذریعہ نہ صرف مصنف کے خاندانی ونجی تفصیلات، نظریات اور ذہنی وفکری نشوونما کو سمجھا جا سکتا ہے بلکہ ان تحریروں میں مصنف کے دور کے تمام سیاسی، سماجی وتہذیبی حالات کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مبسوط اور بہتر طریقہ سے لکھی گئی آپ بیتی، یاداشتیں، روز نامچے، خودنوشت سوانح عمریاں ایک ''نجی تحریر'' ہونے کے باوجود مخصوص دور کی معاشرتی تاریخ بن جاتی ہیں۔اس صنفِ ادب میں سوانح نگار اپنی یادداشت اور مشاہدات کی بنیاد پر جہاں اپنی زندگی کے

متعلق داخلی و خارجی حالات اور واقعات نیز دیگر تفصیلات رقم کرتے ہیں وہیں ارادی یا غیر ارادی طور پر اپنے ہم عصر افراد کے افکار و افعال بھی رقم کرتے چلے جاتے ہیں۔جس کے نتیجے میں بالواسطہ طور پر گویا ایک مکمل معاشرتی تاریخ منصۂ شہود پر آجاتی ہے۔جیسا کہ عمر رضا لکھتے ہیں۔

''سوانحی تحریروں سے کسی بھی ملک کے خاص عہد، سماج اور دیگر حالات و اقعات کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سوانحی ادب کی تاریخی، سماجی و ثقافتی ،نفسیاتی ،اخلاقی اور جمالیاتی اہمیت و افادیت ایک مسلمہ حقیقت بن جاتی ہے۔(۱)

اس ضمن میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا خیال ہے کہ

''کسی بھی بڑے آدمی کی سوانح عمری تنہا اس کی سوانح عمری نہیں ہوتی۔اس کا ماحول اور اس کے ماحول سے وابستہ بہت سے افراد اور اشخاص بھی اپنے ذہن اور زندگی کے اعتبار سے اس میں شریک ہوتے ہیں اور ایک سوانح عمری کا مطالعہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی ایک انسان کی ہی زندگی کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ اس سے وابستہ بہت سے پہلوؤں کا مطالعہ ہے جس میں تاریخ و تہذیب دونوں ہی سمٹ آتے ہیں''(۲)

اردو میں آپ بیتی ،یاداشتیں، روزنامچے، خودنوشت سوانح عمریاں لکھنے کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد ہوتا ہے۔(۳) اگر چیکہ ۱۸۵۷ کے بعد جدید اردو نثر کی کئی ایک اصناف وجود میں آئیں اور تیزی سے ان کا فروغ ہوتا گیا لیکن سوانحی ادب کی رفتار نسبتاً کم نظر آتی ہے۔جبکہ سوانحی ادب میں بالخصوص خودنوشت یا آپ بیتیوں کی تعداد دیگر تحریروں کے مقابلے میں نہایت کم قرار دی جاسکتی ہے۔اس کی اہم وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کا سماجی و تہذیبی ماحول کسی فرد یا اس کے ہم عصر افراد کے متعلق حقائق کے اظہار کے لیے بڑے عرصے تک سازگار نہیں رہا۔اس نوعیت کی تحریریں ''نجی تحریر'' میں شمار ہوتی تھیں لہذاء انھیں منظرِ عام پر لانے سے بھی گریز کیا جاتا رہا۔ابتدائی دور کی جو تحریریں منظرِ عام پر آئیں ان میں مصنف کی زیادہ تر توجہ اس دور کے مخصوص کارناموں یا اہم واقعات تک رہی۔ان تحریروں میں خود مصنف کے متعلق حقیقت بیانی سے گریز کے رویے کو بھی بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔دراصل خود اپنی شخصیت سے متصادم ہونا اور مکمل حقیقت

(۴)

بیانی سے کام لے کر اپنا اور اپنے عہد کا خاکہ صفحۂ قرطاس پر من وعن اتار دینا کسی بھی مصنف کے لیے مشکل ترین کام بن جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر خودنوشت یا آپ بیتیوں میں مصنف کا اپنی باطنی شخصیت پر کھل کر اظہارِ خیال عنقا ہوتا ہے۔جیسا کہ مقبولِ عام شاعرہ وادیبہ کشور ناہید لکھتی ہیں

''شاعری کرنا اور بات ہے اور اپنے بارے میں لکھنا اور۔۔۔کسی بھی فنکار یا قلم کار کے لیے یہ اتنا ہی مشکل مرحلہ ہوتا ہے جب وہ اپنے بارے میں قلم اٹھاتا ہے''(۴)

جب کہ عمر رضا کے خیال میں ''خودنوشت کا فن بے حد مشکل اور صبر آزما ہے۔خودنوشت لکھنا کانٹوں پر چلنے کے مترادف ہے۔اس فن کے ساتھ وہی خودنوشت نگار انصاف کرسکتا ہے جو کانٹوں کی پرواہ کیے بغیر اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہنے کا حوصلہ رکھتا ہے''(۵)

تاہم حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سے اردو کی شعری و نثری اصناف میں وقت کے ساتھ ساتھ ہئیت ،اسلوب و ٹیکنک میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اسی طرح اس صنفِ ادب یعنی خودنوشت سوانح عمریوں کے خدوخال بھی بدلتے گئے۔لہذاء یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں چند ایک بہترین خودنوشت سوانح لکھی گئیں۔جنھیں ہم تاریخ ،تہذیب اور ادب کے حوالے سے ایک اہم ماخذ قرار دے سکتے ہیں۔نثر کی اس اہم صنفِ ادب کی باقاعدہ ابتداء کو تقریباً ایک صدی سے زائد کا عرصہ ہوگیا لیکن اردو زبان میں یہ ادبی سرمایہ کمیت کے اعتبار سے آج بھی کم ہی نظر آتا ہے۔اس تناظر میں جب ہم خواتین کی تحریر کردہ '' یادداشتوں یا خود نوشت سوانح عمریوں'' کا جائزہ لیتے ہیں تو اور بھی خراب صورتحال واضح ہوتی ہے۔مردوں کی بہ نسبت اردو میں خواتین کی تحریر کردہ آپ بیتیوں یا خودنوشت کی تعداد نہایت ہی کم ہے۔اگر چیکہ چند ایک خواتین نے

اردو میں خودنوشت لکھی ہیں لیکن ان کے متعلق معلومات بھی کم ہی دستیاب ہوتی ہیں۔اس موضوع پر جو تحقیقی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں ان میں بہ مشکل دو ایک خواتین کے نام شامل کیے گئے ہیں۔جبکہ سوانحی ادب کی تاریخ کا نہایت گہرائی سے جائزہ لیں تو ایک حیرت انگیز حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ جہاں مولانا جعفر تھانیسیری کی تصنیف ''تواریخِ عجیب'' بہ موسوم'' کالا پانی'' اور عبدالغفور نسّاخ کی تصنیف'' سوانح عمری'' کو اردو کی اولین خود نوشت سوانح قرار دیا گیا ہے جو بالترتیب ۱۸۸۴ء اور ۱۸۸۷ء میں لکھی گئیں۔ وہیں اسی دور میں شہر بانو بیگم (دختر نواب اکبر علی خاں رئیس پاٹودی) کی ۱۸۸۷ میں تحریر کردہ خودنوشت ''بیتی کہانی'' کے متعلق کہیں ذکر نہیں ملتا۔۸۹صفحات پر مشتمل اس خودنوشت کو شہر بانو بیگم نے ایک انگریز خاتون مس فلیچر کے کہنے پر ۱۸۸۵ء سے رقم کرنا شروع کیا اور ۱۸۸۷ میں مکمل کر لیا اور ایک دیباچہ کے ساتھ اسے کتابی شکل دے دی۔ ۱۸۵۷ کے بعد کے حالات پر مشتمل یہ مختصر سی خودنوشت کئی ایک اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے ۔اس نایاب اور کم یاب خودنوشت کو معین الدین عقیل نے ۱۹۸۵ء میں مرتب کیا اور پاکستان سے شائع کیا۔(۶)

جیسا کہ پچھلی سطور میں تحریر کیا گیا کہ ''خودنوشت ،یاداشتیں ،یا آپ بیتی'' ایک ایسی تحریر ہے جس میں ادیب اپنی ذات، اپنے تجربات اور مشاہدات کو ادب کے کینوس پر اتارتا ہے۔اس تصویر کشی میں تاریخ،تہذیب،سیاسی وسماجی مناظر بھی قید ہو جاتے ہیں۔ جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر ادیب کا اپنا ایک زاویہ نگاہ ہوتا ہے جس سے وہ خود کو اور اپنے عہد کے واقعات و سماج کو دیکھتا ہے ۔ اس حوالے سے

(۵)

کہا جا سکتا ہے کہ جہاں مرد ادیبوں کا اپنا ایک منفرد ادراک اور زاویہ نگاہ ہوتا ہے ویسے ہی خواتین کے مشاہدات اور حالات و واقعات کے تئیں ان کا اپنا احساس ورد عمل مختلف و جداگانہ ہوسکتا ہے ۔جو بہ حیثیتِ بنی نوع انساں کے نہایت اہم ہے۔لہذا ء کسی سماج و معاشرہ کی تصویریں جو خواتین کے قلم سے کھینچی گئی ہوں وہ تصویریں منفرد زاویہ نگاہ ہونے کی بناء پر اور بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہیں ۔چونکہ خودنوشت ،یاداشتیں ،یا آپ بیتی صرف اپنے عہد کی معاشرتی تاریخ ہی نہیں ہوتی بلکہ اس میں خواتین کا اظہارِ ذات بھی شامل ہوتا ہے ۔ نیز ان تحریروں میں کئی ایک واقعات یا بین السطور میں موجود احساسات و جذبات پوشیدہ ہوتے ہیں۔لہذاء ان تحریروں کا مطالعہ وتجزیہ ہندوستانی سماج کے ڈھانچے ،خواتین کے متعلق تصورات ونظریات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ ہندوستان میں کسی خاص عہد کے مطالعہ یا بازیافت کے لیے ان تحریروں کو اہم ترین ماخذ کا درجہ دیا جا سکتا ہے ۔اردو کے حوالے سے صرف چند خودنوشت نگار خواتین کے نام دستیاب ہیں ان میں **جمال النساء** ایک اہم نام قرار دیا جا سکتا ہے۔ جمال النساء نے اپنی کتاب'' بکھری یادیں'' میں بڑی غیر جانبداری سے نہ صرف اپنے عہد کے تمام حالات کو رقم کیا ہے بلکہ اپنی شخصیت کو مختلف پرتوں میں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے نہایت سادہ وسلیس انداز میں تمام حقائق کو صفحات پر بکھیر دیا ہے۔

جمال النساء'' بکھری یادیں'' تحریر میں آنے کے اسباب یوں لکھتی ہیں،ملاحظہ کیجیے

''ایک دور ایسا بھی آیا کہ راتوں کی نیند غائب۔ پرانی یادوں اور باتوں کی جیسے ایک فلم ہر وقت نظروں کے سامنے۔ خالی بیٹھے بیٹھے سوچا،ان یادوں کو قلمبند کر دوں تو شائد کچھ وقت ہی کٹے اور دماغ کو سکون ملے۔یوں اختر کے جانے تک کی ساری یادیں نہ جانے کیسے لکھ ڈالیں۔ یہ مسودہ پڑا ہوا تھا۔۔۔ایمن اور ذکیہ کا اصرار کہ اختر کے بعد سے اب تک کے حالات بھی لکھوں۔۔۔وہ بھی جیسے تیسے لکھ ڈالے۔''

(۷)

درجہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب دو مختلف وقتوں میں لکھی گئی۔یعنی جمال النساء کے بھائی اختر حسن کے انتقال تک وقوع پذیر واقعات کو قلمبند کرنے کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ بعد میں کچھ اور یادوں کو اس کتاب میں شامل کیا گیا۔تاہم بعد کا تحریر کردہ حصّہ نہایت مختصر ہے جبکہ پہلے دور میں

لکھی گئی تحریر برسوں پر محیط اہم واقعات وتفصیلات پر مبنی ہے۔

''بکھری یادیں'' کے ابتدائی صفحات مصنفہ کے خاندان و آباواجداد کی تفصیلات کے علاوہ جمال النساء کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ان صفحات کے مطالعہ سے حیدرآباد کے ماضی کی ان اہم تاریخی روایتوں کو دیکھا جا سکتا ہے جس میں صدیوں سے بیرونِ ممالک کے علاوہ ہندوستان کے دیگر شہروں سے پریشان ومفلوک الحال افراد یا اہلِ علم ودانش، ادیب وشاعروں کی آمد کا سلسلہ رہا تھا۔ بیرونِ ریاست سے آنے والے افراد کے لیے حیدرآباد ہمیشہ سے ہی محفوظ و پر امن مسکن بنا رہا۔ جہاں صدیوں سے مختلف مذاہب کے لوگ آتے رہے شاد وآباد ہوتے رہے۔ جمال النساء کا خاندان بھی موہان سے یہاں آکر بس گیا تھا۔اس کتاب میں جمال النساء اپنے آباواجداد کے متعلق لکھتی ہیں کہ'' ان کے خاندان کے ایک بزرگ عالم سید محمد نیشا پور (ایران) سے ہجرت کی اور ہندوستان آکر قصبہ موہان میں بس گئے۔نیشا پور کے علاوہ ایران کے دیگر مقامات سے بے شمار افراد مختلف وقتوں میں موہان آکر بس گئے تھے۔ان میں کئی ایک علم و ہنر میں ماہر تھے۔ تجارت ،درس و

(۶)

تدریس اور کھیتی باڑی کے کام انجام دیتے اور گذر بسر کرتے۔زیادہ تر آپسی رشتوں میں ہی شادیاں انجام دی جاتیں۔ چند ایک افراد نے وہیں کی لڑکیوں سے شادیاں بھی انجام دیں۔شیعہ اور سنّی کی تفریق کم تھی۔ بیرونِ ملک سے آئے بے شمار افراد کی موجودگی کی وجہ سے موہان کو''خطہّ یونان'' بھی کہا جاتا تھا۔ کثرتِ افراد کے نتیجے میں روزگار کے مسائل بڑھنے لگے تو لوگ وہاں سے ہجرت کرنے لگے۔بالخصوص نظام شاہی حکومت کے چھٹے بادشاہ میر محبوب علی خاں کے دور میں موہان سے بہت سے افراد ریاستِ حیدرآباد آکر بس گئے تھے ان میں جو اہلِ علم و ہنر افراد تھے انھیں آصف جاہی سلاطین نے خاص عہدوں پر فائز کیا۔ جمال النساء کے دادا سید سلطان حسن نے بھی تلاشِ روزگار کے سلسلہ میں ریاستِ حیدرآباد کا رخ کیا تھا۔انھوں نے یہاں وکالت کا امتحان پاس کیا اور وکیلِ سرکار کی حیثیت سے''کلیانی اسٹیٹ'' میں ناظم ہو گئے۔'' نظام اسٹیٹ'' اس وقت مختلف چھوٹی بڑی جاگیروں یا سمستانوں، ریاستوں اور رجواڑوں وغیرہ میں بٹا ہوا تھا۔جس جاگیر کا مالک مسلمان ہوتا وہ''نواب'' کہلاتا تھا اور جس کا مالک ہندو ہوتا وہ''راجا''۔چار پانچ لاکھ والی جاگیریں کم تھیں لیکن لاکھ دو لاکھ آمدنی والی تو بہت تھیں۔اس کے علاوہ تین پائیگاہیں تھیں جن کی آمدنی لاکھوں کی تھیں۔سب سے زیادہ آمدنی والا اسٹیٹ نواب سالار جنگ بہادر کا تھا۔نظام کے تحت کا علاقہ'' صرفِ خاص'' کہلاتا تھا۔۔۔۔ریاست میں تین زبانیں عام تھیں۔تلگو ،مراٹھی اور اردو۔۔۔کنڑ بھی کچھ علاقوں میں بولی جاتی تھی۔''(۸)

جمال النساء کو ورثہ میں علم و ادب کا شیدا خاندان ملا تھا۔ان کے دادا کا تعلق مولوی گھرانے سے تھا جبکہ دادی امام باڑے سے تھیں۔دادا اور دادی دونوں اردو، فارسی ،عربی اور ترکی زبانوں کے ماہر تھے۔دادا کو شاعری کا بے حد شوق تھا۔ پھوپی حمیدہ بیگم بھی اردو و فارسی زبان میں مہارت رکھتی تھیں۔ پھوپی حمیدہ بیگم خوش خطی میں اتنی ماہر تھیں کہ انھوں نے فارسی کی ضخیم کتاب'' صولتِ فاروقی'' کو خوبصورت خط میں نقل کیا تھا۔ جمال النساء کی پھوپی زاد بہن سعیدہ بیگم کو بھی اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ وہ''س ب'' کے نام سے رسالہ'' تہذیبِ نسواں'' میں مضامین لکھا کرتی تھیں۔ جمال النسا کے والد اکبر حسین بھی تعلیم یافتہ اور باذوق شخص تھے۔انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا تھا اور''کلیانی اسٹیٹ'' میں روزگار سے وابستہ ہو گئے تھے۔انھیں بھی مختلف زبانوں پر عبور حاصل تھا۔شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔انھوں نے اردو میں ایک ناول بھی لکھی تھی جو بقول جمال النساء کے روزگار کے سلسلے میں نقلِ مکانی کے نتیجے میں کہیں ضائع ہو گئی۔حسرت موہانی سے جمال النساء کے والد کی رشتہ داری تھی لیکن وہ ان کے خاص دوست کی حیثیت رکھتے تھے۔ جمال النساء کے دو چچا تھے۔ ان کے چھوٹے چچا نے حسرت موہانی کے ساتھ مل کر آزادی کی لڑائی میں حصّہ لیا تھا۔کانپور میں حسرت موہانی کے قائم کردہ''سودیشی اسٹور'' پر عرصہ تک وہ کام کرتے رہے۔انھوں نے سودیشی تحریک میں بڑھ

چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ جمال النساء کی والدہ اقبال النساء کا تعلق ''کلیانی اسٹیٹ'' سے تھا۔ جملہ نو لڑکے اور لڑکیوں میں جمال النساء ان کی سب سے پہلی اولاد تھیں۔ وہ ۱۹۱۳ء کو ضلع نظام آباد (ریاست تلنگانہ) میں پیدا ہوئیں۔

جمال النساء کے دادا اور والد چونکہ روزگار کے سلسلہ میں مختلف اسٹیٹس پر خدمات انجام دیا کرتے رہے۔ انھیں دور دراز کے مقامات اور دیہاتوں میں قیام کرنا پڑتا۔ جہاں تعلیمِ نسواں کا کوئی نظم نہیں تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم گھر پر ہی ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا حسبِ

(۷)

روایت جمال النساء کی تعلیم گھر پر ہی ہوتی رہی۔ جبکہ ان کے بھائیوں کو شہرِ حیدرآباد میں رکھ کر تعلیم دلوائی گئی۔ البتہ کچھ عرصہ بعد جب وہ سب حیدرآباد منتقل ہوگئے تو ان کی بہنوں کو بھی اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ ان کے والد صاحب کے اس اقدام پر خاندان کے افراد کی جانب سے خوب مخالفت کی گئی۔ لیکن ان کے والد صاحب نے تمام مخالفتوں کے برخلاف لڑکیوں کی تعلیم کا خاص خیال رکھا۔ ذیل کے اقتباس میں تعلیمِ نسواں کے متعلق اس دور کے نظریات کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید خیالات کے حامل افراد کے ٹکراؤ اور بدلتے رجحانات کو بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

جمال النساء ''بکھری یادیں'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''چچا میاں تو پہلے ہی بھائی سے ناراض تھے کہ بچوں کو اسکول میں پڑھا رہے ہیں۔ ایک دن ملنے آگئے۔ رضیہ، رابعہ کو ایک ہندو نوجوان طالبِ علم سے حساب وغیرہ سیکھتے دیکھ کر زور سے اِنَ للہ پڑھا اور الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔۔۔۔ ایک دن آستین چڑھا کر ابّی سے لڑنے ہی آگئے تم کیا بے ہودہ حرکت کر رہے ہو۔ لڑکیوں کو اسکول کیوں بھیج رہے ہو۔ رضیہ ریڈیو پر مضمون پڑھتی ہے۔ نامحرم اس کی آواز سنتے ہیں۔۔۔ ابی حسبِ عادت خاموش باتیں سنتے اور مسکراتے رہے''(۹)

اس وقت تک چونکہ جمال النساء سنِ بلوغت میں داخل ہوچکی تھیں اسی لیے انھیں باقاعدہ اسکول کی تعلیم کا موقع فراہم نہیں کیا جاسکا۔ جب کہ ان کی بہنوں' رضیہ اکبر، رابعہ برنی اور ذکیہ عادل کو باقاعدہ تعلیم کا موقع ملتا رہا اور انھوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ رضیہ اکبر نے تہران یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد شعبہ فارسی' جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہوئیں اور درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ ان کی دوسری بہنیں' رابعہ برنی اور ذکیہ عادل نے بھی اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل کی۔ جمال النساء کو اگرچیکہ تعلیم کے حصول کا موقع میسر نہیں آیا تھا لیکن انھیں مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ گھر پر اردو کی کتابیں اور کئی ایک رسائل انھیں پڑھنے کو مل جاتے۔ جن کے مطالعہ سے ان کے علم اور ادبی ذوق میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا جس کے نتیجہ میں ان کی فکر بالیدہ ہونے لگی اور اظہار کے لیے منفرد راہ تلاش کرنے لگی۔

جمال النساء کی ذہنی و فکری نشو و نما کی ابتداء ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔

''آپا (پھوپی زاد بہن) نے میرے نام ''تہذیبِ نسواں'' جاری کروادیا تھا۔ مطالعہ کا شوق تبھی سے تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے کچھ زیادہ اچھا نہ لگا۔ اب تو بس اتنا یاد ہے کہ اس میں شوہر کو کیسے رام کریں۔ ساس سسر سے کیسے برتاؤ کریں وغیرہ قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ جن کے بارے میں مجھے نہ کوئی علم تھا نہ جاننے کی فکر یا دلچسپی''(۱۰)

اگرچہ کہ اس دور میں لڑکیوں کی پرورش اور ایک ''بہترین خاتونِ خانہ'' والی شخصیت کی تشکیل کے لیے اسی طرح کا ادب لکھا جاتا تھا۔ لیکن درجہ بالا مذکورہ سطور سے یہ اندازہ بھی بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اسی دور میں روایتی اصول و ضوابط اور طور طریقوں سے بیزار اور انحراف کرنے والے ذہن بھی تیار ہو رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جمال النساء کو حصولِ تعلیم کے لیے باقاعدہ

(۸)

سازگار ماحول نہ ہونے کے باوجود ان کی شخصی، ذہنی و فکری نشو و نما کی انفرادیت کو کوئی روک نہ سکا۔ مطالعہ کے شوق میں جمال النساء

نے ڈھیر ساری کتابیں پڑھ لیں حتیٰ کہ انھوں نے اپنے بہن بھائی کی مدد سے انگریزی زبان بھی سیکھ لی اور بہت جلد War and- Peace ,Anna Karenina- جیسے ناول بھی پڑھ ڈالے جمال النساء کو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر نہیں آیا تھا لیکن کئی برسوں بعد انھوں نے اپنی ذاتی دلچسپی، محنت اور لگن سے گھر بیٹھے تیاری کی اور منشی فاضل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔ اخبارات ورسائل میں معارف، نگار، خیالستان، ہمایوں، نیرنگِ خیال، ساقی، ادیب، ایشیا، پیام، رہبر وغیرہ کا مطالعہ ان کے شب وروز میں شامل تھا۔ خصوصاً رسالہ نگار سے وہ بہت زیادہ متاثر تھیں اس رسالہ سے وابستگی کی بناء پر تحریکِ آزادی میں حصّہ لینے کا فیصلہ بھی کرلی تھیں۔ جیسا کہ وہ لکھتی ہیں

''سلیم چچا کے مشورہ سے نگار کی خریدار بن گئی۔ سن ۲۸ء سے ۴۷ء تک مستقل طور پر خریدار رہی۔ نہ صرف میرے بلکہ سبھی بھائی بہنوں کی فکری تربیت وتعمیر میں اس رسالہ اور نیاز فتح پوری کی نگارشات کا بہت حصہ ہے۔۔۔ اجنتا ہی میں تحریکِ آزادی سے متاثر ہوکر اور تو کچھ نہ کرسکتی تھی بس سودیشی پہننے کا پکّا ارادہ کرلیا تھا۔''(۱۱)

دراصل جمال النساء کی شخصیت کی بھرپور نشوونما اور فکر ونظر کی بالیدگی نیز سیاسی معاملات میں دلچسپی پیدا کرنے میں ان کے گھریلو ماحول نے بے حد اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ وہ رقم طراز ہیں۔

''گھر میں گاندھی جی، نہرو، محمد علی اور حسرت موہانی وغیرہ کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ اخباروں کے مطالعے نے میری سوجھ بوجھ میں اضافہ کیا بلکہ میرے شعور وفکر کی تشکیل بھی ہوئی۔ ساتھ ہی میری اپنی ایک سیاسی سوجھ بوجھ بھی بننے لگی۔۔۔ اس دوران سیاست سے میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ جن مشہور لیڈروں کے نام اخباروں میں پڑھتی ان کے ساتھ کام کرنے اور ملنے کو دل چاہتا تب ایک ہی خواہش تھی کہ آزادی کی لڑائی میں شریک ہو سکوں۔(۱۲)

ابتدائی برسوں میں ملک کی آزادی کی تحریک میں شمولیت کی خواہش اتنی شدید تھی کہ جمال النساء اپنی عیدی کی رقم جمع کرتیں تاکہ قومی فنڈ میں اسے دے سکے۔ کسی لیڈر کے آنے کی اطلاع ملتی تو پورے پردہ کے اہتمام کے ساتھ اپنے بھائی کے ہمراہ ہولیتیں اور اپنی جمع شدہ رقم ان کے حوالے کردیتیں۔ اسی ضمن میں مولانا محمد علی جوہر انکی بیگم اور دیگر قومی لیڈران سے ملاقات کا انھیں موقع ملا۔ اگرچیکہ قومی لیڈران کی تمام سرگرمیوں سے وہ روشناس تھیں اور کچھ افراد کی معترف بھی، لیکن ملک کی آزادی کے متعلق ان کی اپنی رائے اور قائدانہ کوششوں کو لے کر ان کا اپنا ایک خاص نظریہ بننے لگا تھا۔ جس کا اظہار ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ کیجیے

(۹)

''اپنے ملک میں کمیونسٹ تحریک کے تعلق سے کوئی علم نہیں تھا۔ یہاں تو کانگریس ہی سب کچھ' گاندھی جی سے کوئی خاص عقیدت نہیں تھی جس کا غالباً یہ سبب رہا ہوگا کہ سبھاش چندر بوس جو مجھے بہت اچھے لگتے تھے وہ کانگریس کے صدر چنے گئے تو گاندھی جی نے کسی طرح انھیں صدارت سے ہٹوادیا تھا۔''(۱۳)

شوقِ مطالعہ' گھر کے سیاسی ماحول کے علاوہ ان کے بھائی اختر حسن کی سیاسی، سماجی اور ادبی سرگرمیوں کے اثرات بھی جمال النسا کی شخصیت پر بڑی حد تک مرتب ہوتے رہے۔ لہذا سیاسی معاملات کو لے کر ان کا ذہن پختہ ہوتا گیا۔ بچپن سے ہی تمام بھائی بہن اختر حسن کی نگرانی میں گھر پر ادبی محفلیں سجاتے، شبِ ماہ منعقد کرتے، بیت بازی، کہانیاں اور مختلف موضوعات پر مضامین تحریر کرتے، سیاست پر مباحثے رکھے جاتے۔ دیواری رسالہ'' ماہوار پریم گزٹ'' کی اشاعت بھی ان کی سرگرمیوں میں شامل تھی۔ چونکہ اختر حسن کا ادبی حلقہ کافی وسیع تھا جس میں ترقی پسند قلم کار اور نامور صحافی شامل تھے۔ لہذا وہ اپنے ساتھی ادیبوں اور شعراء کو ان کی بیگمات کے ساتھ گھر پر مدعو کرتے اور مختلف پروگرام منعقد کیے جاتے۔ حیدرآباد آنے والے نامور ادیب وشاعروں میں شائد ہی کوئی ایسے افراد ہونگے جو جمال النساء کے گھر مہمان نہ ہوئے ہوں۔ عرصہ تک حیدرآباد میں مخلوط محفلوں کا ماحول نہیں تھا لہذا گھر پر منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں پہلے پہل تمام خواتین پردہ کے پیچھے بیٹھی سنا کرتیں۔ لیکن دھیرے دھیرے ماحول تبدیل ہونے لگا

ان محفلوں میں خاص کر جمال النسا کی بہنیں رضیہ اور رابعہ بھی مضامین سنانے لگیں۔ گھر کا یہی ماحول اور یہ ادبی سرگرمیاں بعد کے آنے والے دنوں میں اور بھی ساز گار وتعمیری بنتے چلے گئے۔ کچھ ہی عرصہ میں جمال النسا کی بہنیں رضیہ اور رابعہ اچھی افسانہ نگار ومضمون نگار کی حیثیت سے مقبول ہوئیں۔ ان کی تحریریں مجلّہ عثمانیہ، پیام وغیرہ میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ جبکہ دونوں نے ملکر ایک ناول بھی لکھا تھا۔ بقول ان کے جو کہیں ضائع ہو گیا۔ اختر حسن کا شمار بھی اس دور کے دیدہ ور اہلِ قلم میں ہوتا تھا۔ انھوں نے بھی اپنی تحریروں سے سماجی بیداری اور سیاسی تحریک کو خوب تقویت پہنچائی۔ انھوں نے قاضی عبد الغفار کے بعد روزنامہ ''پیام'' کی ادارت سنبھال لی تھی۔ آزادی ہند اور ترقی پسند تحریک کی تاریخ میں ''پیام'' کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ یہ تمام بہن بھائی ترقی پسند نظریات کے قائل اور کمیونسٹ پارٹی کے حامی و سرگرم کارکن بن گئے تھے۔ اگر چیکہ جمال النسا کا ذہن پہلے سے ہی ان نظریات کا حامی ہونے لگا تھا جیسا کہ وہ رقم طراز ہیں

''سوشلیزم اور کمیونیزم کے متعلق کوئی خاص معلومات تو نہیں تھیں لیکن مختلف مضامین وغیرہ کے وسیلے جو بھی حاصل تھیں ان ہی کی بنا پر یہ اپنی پسند بن گیا۔ جنگ کی خبروں پر اکثر افراد جرمنی کی فتح کا خیال ظاہر کرتے مگر میں روس کی فتح پر یقین ظاہر کرتی۔'' (۱۴)

مذکورہ بالا مواقع و ماحول کے علاوہ گھر پر منعقد ہونے والی سرگرمیوں بالخصوص مخدوم محی الدین کی شاعری کا اثر راست طور پر جمال النساء پر پڑتا رہا جس کے نتیجے میں مارکسی نظریات سے ان کی دلچسپی بڑھنے لگی اور وہ چند برسوں بعد کمیونسٹ پارٹی سے عملی طور پر وابستہ ہو گئیں۔ وطن کی آزادی کے ساتھ ساتھ خواتین کی ترقی کے لیے کچھ کر گذرنے کی فکر اتنی شدید تھی کہ انھیں اپنی نجی زندگی سے بھی کوئی خاص دلچسپی پیدا نہ ہو سکی۔ حالانکہ اٹھارہ برس کی عمر میں ان کی شادی 'عزیز الدین سے ہو گئی تھی اور ۱۹۳۸ء میں انھیں پہلا لڑکا جاوید تولد ہوا۔ چند برس بعد انھوں نے ایک اور لڑکے کو جنم دیا تاہم صحت کی خرابی کے باعث یہ لڑکا جلد ہی انتقال کر گیا۔ عزیز الدین تعلیم یافتہ فرد تھے لیکن

(۱۰)

انھیں ملک کی آزادی یا دیگر ادبی' سیاسی وسماجی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جبکہ جمال النساء کی شخصیت اور فکر و خیال کی اڑان نے پہلے ہی اپنی راہ کا تعین کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جمال النساء کے لیے ایک ''خاتونِ خانہ'' کی طرح زندگی گذارنے کا تصور بھی محال تھا جبکہ وہ خود کو ایک ''انقلابی مجاہدِ آزادی'' کے روپ میں دیکھ رہی تھیں۔ نجی زندگی کے متعلق جمال النساء کے خیالات کو ''بکھری یادوں'' کے مختلف صفحات پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔

''میرے لیے شادی کا تصور بھی سوہانِ روح تھا۔ میرا اپنا ایک ذہن بن چکا تھا۔ کچھ مخصوص تصورات اور عزائم تھے ملک کی آزادی کے لیے کام کرنے کی خواہش دل میں جڑ پکڑ چکی تھی اس کے لیے ہر طرح کی سختیاں جھیلنے کو تیار، زندگی بھر کے ساتھی کا موہوم سا تصور کسی شاعر، ادیب، مجاہدِ آزادی جیسا تھا۔'' (۱۵)

''اب سات دن رہ گئے تھے میرے گرفتارِ قفس ہونے میں۔ بھیانک مستقبل کے تصور اور ذہنی کوفت کے سبب سے میری طبیعت بگڑ گئی۔'' (۱۶)

''شادی کے سانحہ سے کچھ قبل ہی میں نے طے کر لیا تھا کہ اب خود کو زندہ باور نہیں کروں گی۔ نہ کوئی خواہش نہ کوئی تمنا۔'' (۱۷)

''شوہر صاحب کیا کماتے تھے کیا خرچ کرتے تھے نہ میں نے کبھی پوچھا نہ ہی انھوں نے کبھی بتایا

۔۔۔۔اب جو یہ علم ہوا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو مجھے بڑی پریشانی لاحق ہو گئی۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا اس حادثے کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی اپنی اور اس کی دونوں کی زندگیوں کو ختم کر لوں۔'' (۱۸)

مجھے اپنے نام نہاد گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ (۱۹)

مندرجہ بالا مذکور سطور میں شادی اور اولاد کے متعلق جمال النساء کے خیالات اور ان کی نفسیاتی الجھن کو سمجھا جا سکتا ہے۔ باوجود اس کے حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے شادی شدہ زندگی سے

جڑی تمام ذمہ داریاں نبھائیں اور ساتھ میں سیاسی وسماجی اور عملی زندگی کے لیے بھی خود کو وقف کر دیا۔ دراصل انھیں اپنے شوہر عزیز الدین اور بھائی اختر حسن کی جانب سے وہ تمام تر مواقع ملتے رہے جس میں وہ اپنے ارادوں کو عملی شکل دے سکتیں۔ حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کے قیام کے ابتدائی دور سے ہی وہ وابستہ ہوگئی تھیں اور دیگر خواتین' یشودھا بہن اور تائی، کملا دیوی، برج رانی وغیرہ کے ساتھ ملکر مختلف کام انجام دینے لگی تھیں۔ اسی دوراں ۱۹۴۵ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے موقع پر نامور ادیب و شعراء سے انھیں ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ ان کی تقریروں اور تحریروں سے حوصلے مزید بلند ہونے لگے لہذا وہ پارٹی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگیں۔ انھیں جلد ہی پارٹی کے اہم امور کی ذمہ دار بنا دیا گیا۔ جس میں بظاہر انجام دی جانے والی سرگرمیوں کے علاوہ انگریزوں اور حکومتِ وقت کے خلاف خفیہ طور پر انجام دیے جانے والے مختلف کام بھی تھے۔ ان کاموں کی انجام دہی میں دیگر کامریڈز کے ساتھ اختر حسن اور مخدوم محی الدین

(۱۱)

پیش پیش رہا کرتے تھے۔ کامریڈز کی روپوشی کے دور کی تمام تر سرگرمیوں میں راست طور پر جمال النساء بھی شامل رہتی تھیں۔

''بکھری یادیں'' کے مطالعہ سے ترقی پسند تحریک کا ابتدائی دور، آزادی ہند کی تحریک کے دوراں زیریں سرگرمیاں، سقوطِ حیدرآباد کے دور کا انتشار، ملک کے پہلے الیکشن کے حالات، سیاسی جلسے وجلوسوں میں خواتین کی شرکت اور ان کی حصّہ داریاں نیز تلنگانہ تحریک کی شروعات کے متعلق کئی ایک اہم احوال سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کی رات کا ایک منظر ملاحظہ کیجیے

'' اسی دن اختر روپوشی سے باہر نکل آئے تھے۔ اس رات ملے پلی میں موت جیسا سناٹا تھا۔ سوائے میرے اور شائد دو ایک گھروں میں روشنی، ہر طرف سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لوگ ڈرے سہمے گھروں میں بند بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر دل میں دہشت تھی۔''(۲۰)

''بکھری یادیں'' کے اوراق جہاں بے شمار سیاسی وسماجی حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں وہیں ایک اور ان سنی حقیقت بھی بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب کے بین السطور میں مخدوم محی الدین سے جمال النساء کی محبت کو بھی بہ خوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جمال النساء نے اگرچیکہ کھل کر اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا ہے لیکن مخدوم محی الدین کے متعلق جب بھی تحریر کیا ہے تو اپنے احساسات اور کیفیات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ بڑی جراءت سے کام لیتے ہوئے مخدوم محی الدین کے ساتھ گذارے ہوئے دن اور مختلف واقعات و سرگرمیوں کو اس طرح سے قلمبند کیا ہے کہ وہ جامد نہیں لگتے بلکہ ان کے سرد وگرم احساس کو قاری محسوس کر سکتا ہے۔ مخدوم محی الدین کے انتقال کے وقت ان کی جذباتی کیفیت اور ان کے انتقال کے بعد اپنی تنہائی اور جذبات واحساسات کو جن لفظوں میں پرویا ہے اس کی ایک جھلک دیکھیے ادھورے خواب سونپ کر کہاں چلا گیا ہے تو؟

بجھی بجھی ہے روشنی / دھواں دھواں ہے بام و در /
پکارتی ہے رہ گزر / کہاں چلا گیا ہے تو؟

خالی ترے وجود سے ہر گوشۂ وجود / نے مژدہ نگاہ، نہ تسکین جاں ودل

تنہائیاں سناتی ہیں آواز پاتری / خاموشیوں میں اب بھی ہے ترے نغموں کا بانکپن (۲۱)

سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ جمال النساء کی عملی زندگی کا اہم میدان ''خواتین کی تعلیم و با اختیاری'' تھا۔ حیدرآباد کی تاریخ میں ۱۹۴۸ء کا پولیس ایکشن بدترین دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے حیدرآباد میں حالات نہایت ہی ابتر ہوگئے تھے۔ بے شمار افراد معاشی طور پر مفلوک الحال و پریشان ہوگئے تھے۔ ایسے ماحول میں جمال النساء نے چند ہم خیال خواتین کے ساتھ ملکر ناخواندہ وغریب خواتین میں شعور بیداری اور تعلیم وترقی کے لیے کام کرنا شروع کیا اور مختلف محلات اور جھونپڑ پٹیوں میں جا کر تعلیم دینے نیز اپنے گھر پر انھیں ہنر سکھانے کی شروعات کی۔ جس کے لیے انھیں سماجی سطح پر بہت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ چند برسوں میں

ماحول بہتر ہو تا گیا اور بے شمار خواتین اس مشن سے جڑ تی

(۱۲)

چلی گئیں۔ جمال النساء نے غریب و مجبور خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے ایک سوسائٹی ''حیدرآباد ویمنس انڈسٹریل سوسائٹی'' قائم کی تھی۔ تا کہ ان کے لیے منظّم طریقہ سے کوششیں کی جا سکے۔ اس سوسائٹی کے تحت ہر برس نمائش منعقد کی جاتی جس میں خواتین کی جانب سے تیارشدہ اشیاء کی فروخت کا اہتمام کیا جاتا۔ علاوہ ازیں ان کی حوصلہ افزائی کے لیے موقع بہ موقع ادبی وتہذیبی پرو گرامس کا انعقاد بھی ہوا کرتا۔ جس سے سوسائٹی کے لیے فنڈ اکھٹا کیا جاتا۔ ہر برس ۸/مارچ کو ''خواتین کا دن'' منایا جاتا۔ جس میں مخدوم کے علاوہ بے شمار نامور قلم کاروں نے شرکت کی تھی۔ خواتین اور بچوں کے حقوق پر جلسے منعقد کیے جاتے۔ ریالیاں نکالی جاتیں۔ اردو اور دیگر زبان میں ورقیے تقسیم کیے جاتے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں خواتین تعلیم و ہنر سیکھنے کی طرف متوجہ ہوتی رہیں۔ روز افزوں ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔

عالمی سطح پر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ حرکیاتی خواتین نے ایک تنظیم ''ورلڈ ویمنس ڈیموکریٹک فیڈریشن'' بنائی تھی جو نہ صرف سیاسی معاملات بلکہ خواتین کی ترقی کے لیے مختلف سطحوں پر کارگر تھی۔ اسی نہج پر ہندوستان میں بھی ۱۹۵۴ء میں ''انڈین نیشنل ویمنس فیڈریشن'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس تنظیم کے لیے پینتالیس اہم ارکان پر مشتمل ورکنگ کمیٹی بنائی گئی تھی جس میں جمال النساء بھی شامل تھیں۔ اس فیڈریشن کے اولین جلسے حیدرآباد اور وجے واڑہ میں منعقد کیے گئے۔ جس کی تمام تر ذمہ داری جمال النساء کے سر تھی۔ اپنی فعالیت سے جمال النساء نے اس تنظیم کی کارکردگی میں جان ڈالدی تھی۔ اس کے تحت خواتین کی ترقی و سیاسی وسماجی شعور بیداری پر بے حد اہم کام انجام دیے گئے۔ جس کے نتیجے میں خواتین منظّم اور متحد ہو کر اپنے حقوق کو جاننے لگیں اور ان کے حصول کے لیے ان میں شعور بھی بیدار ہوتا گیا۔ چند برسوں بعد یہ جلسے مختلف شہروں میں منعقد ہوئے۔ جس میں شرکت کے لیے جمال النساء نے مختلف مقامات کا سفر بھی کیا اور پروگراموں میں حصّہ لیا۔ ملک کی آزادی کے بعد پارٹی کی جانب سے فیڈریشن سے وابستہ خواتین کے وفد کو روس، ازبکستان، تاشقند وغیرہ کے دورہ پر بھیجا گیا۔ اس وفد میں جمال النساء بھی شامل تھیں۔ انھیں لینن اور اسٹالن کی آخری آرام گاہوں پر جانے کا موقع دستیاب ہوا۔ اس سفر کی تفصیلات کو جمال النساء نے اپنی کتاب ''بکھری یادوں'' کا حصّہ بنایا ہے۔ جس کے مطالعہ سے نہ صرف وہاں کی تہذیب وتمدن کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ ایک بہترین سفر نامے کے مطالعہ کا احساس بھی ہوتا ہے۔

جمال النساء کئی برسوں تک کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم کارکن رہیں لیکن بعد میں پارٹی سے ان کی دلچسپی اور وابستگی کم ہوتی گئی جس کی وجہ انھوں نے پارٹی سے وابستہ افراد کی آپسی رسہ کشی، اختلافات نیز بنیادی نظریات میں تبدیلی کو قرار دیا ہے۔ لہذا انھوں نے پارٹی سے دوری اختیار کر لی۔ دوسری طرف پارٹی والوں نے بھی جمال النساء کی حصّہ داریوں کو فراموش کر دیا۔

''بکھری یادیں'' کے مطالعے سے قاری نہ صرف مجموعی طور پر جمال النساء کی فعال زندگی کے شب وروز نیز اس دور کی تمام معاشرتی زندگی سے بھرپور طریقے سے متعارف ہوتا ہے۔ بلکہ اس کتاب کے حوالے سے جمال النساء کی بے باک ونڈر اور اولوالعزم شخصیت اور ان کے عہد کا تجزیہ کیا جائے تو کئی ایک حیران کن پہلوؤں کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ جمال النساء کی ابتدائی

(۱۳)

زندگی کے برس ایک ایسے دور پر محیط ہیں جہاں لڑکی کی تعلیم یا عملی زندگی میں اس کی حصہ داری کا رجحان سماج میں پوری طرح پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ اس دور میں لڑکیوں کو ان کی شخصیت کی مکمل نشو نما یا اظہارِ خیال کے لیے بھرپور مواقع دیے جاتے تھے۔ بلکہ عورت کے وجود کو صرف گھریلو معاملات کی ذمہ دار و افزائشِ نسل کا کام انجام دینے والی ایک فرد تصور کیا جاتا تھا۔ ایسے دور میں جمال النساء نے ابتداء ہی سے اپنی منفرد سوچ وفکر کی حامل شخصیت کو اس دور کے تقاضوں اور سماجی نظریات کے برخلاف ڈھالا۔ اپنے لیے مواقف حالات بنانے کی بھرپور کوشش کی اور اپنی عملی زندگی کے لیے ایک

جداگانہ راہ تلاش کی۔ جس کے نتیجے میں انھیں مواقع ملتے رہے اور وہ بڑی بہادری سے ان راہوں پر چلتے ہوئے نہ صرف ایک انقلابی مجاہدِ آزادی بن کر ملک کی آزادی میں سرگرم رول نبھایا بلکہ سیاسی و سماجی جہد کار کی حیثیت سے دیگر تحریکات اور خواتین کی ترقی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر ڈالی۔

جمال النساء کا یہ کارنامہ بھی نا قابلِ فراموش قرار دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام تر ''بکھری یادوں'' کو کتابی شکل میں پوری سچائیوں کے ساتھ محفوظ کر دیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے بدلتے سماجی و سیاسی حالات ،تغیر پذیر تہذیب، قدیم و جدید فکر کے حامل افراد کا آپسی ٹکراؤ نیز مختلف سیاسی و سماجی اور ادبی تحریکات اور ان سے وابستہ سینکڑوں افراد کے احوال و عادات کے ساتھ ساتھ جمال النساء کی شخصیت کے ظاہری و باطنی پہلو اپنی پوری حقیقت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان تمام خصوصیات کی بناء پر اس یادداشت کو ایک جامع معاشرتی تاریخ کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ جس کا مطالعہ کئی حقائق کو جاننے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

OOO

حوالہ جات

۱۔ عمر رضا ''اردو میں سوانحی ادب۔ بن اور روایت، ۲۰۱۳، ص ۱۸

۲۔ بحوالہ ''اردو میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقاء۔ از ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، ص ۷

۳۔ پروفیسر وہاج الدین علوی ''اردو خودنوشت۔ فن اور تجزیہ، ۱۹۸۹، ص ۴۱۷۔

۴۔ ابتدائیہ ''بری عورت کی کتھا''۔ بحوالہ ''اردو کے شہرہ آفاق خودنوشت۔ ایک تجزیاتی مطالعہ'' از ڈاکٹر ایس مظفر الدین، ۲۰۰۵، ص ۲۱

۵۔ اردو میں سوانحی ادب، ۲۰۱۳، ص ۹۰

۶۔ خودنوشت۔ بیتی کہانی۔ از شہر بانو بیگم (دختر نواب اکبر علی خاں رئیس پاٹودی) مرتب معین الدین عقیل، ۱۹۸۵، ص ۸

۷۔ جمال النساء ''اس تحریر کے بارے میں'' مشمولہ ''بکھری یادیں'' ص ۹

۸۔ جمال النساء ''بکھری یادیں'' ص ۱۰۔۱۴

۹۔ ایضاً' ص ۹۲

۱۰۔ ایضاً' ص ۲۷، ۲۸

(۱۴)

۱۱۔ ایضاً' ص ۵۳

۱۲۔ ایضاً' ص ۴۵، ۴۶

۱۳۔ ایضاً' ص ۹۴

۱۴۔ ایضاً' ص ۹۴

۱۵۔ ایضاً' ص ۵۳

۱۶۔ ایضاً' ص ۶۱

۱۷۔ ایضاً' ص ۶۵

۱۸۔ ایضاً' ص ۷۸

۱۹۔ ایضاً' ص ۸۰

۲۰۔ ایضاً' ص ۱۱۳

۲۱۔ ایضاً' ص ۲۱۱

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات "idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

ماہ نامہ 'سب رس' انٹرنٹ پر

www.sherosokhan.com

برقی کتب کلک کرنے پر دیکھا جا سکتا ہے۔

مضمون

نصرت جبین

پروین شاکر کے نسوانی کرب کا تخلیقی اظہار ('صد برگ' کے خصوصی حوالے سے)

میرؔ نے یوں ہی نہیں کہا تھا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پروین شاکر بیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں اُردو شاعری کے آسمان پر چمکنے والے شعری ستاروں میں ایک اہم نام ہے۔ یہ وہ نسائی آواز تھی جس نے بہت ہی قلیل عرصے میں وہ شہرت حاصل کی جو بہت کم خوش نصیب لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ زندگی کی چند مختصر بہاریں دیکھ کر ہی اس کو خزاں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا مگر ان مختصر دنوں کے دوران ہی اس کی شہرت کا ڈنکا اُردو شاعری کے آسمان پر اتنے زور سے بجنے لگا کہ دور تک اور دیر تک اس کو ادب نوازوں کے جلسوں میں نہایت ہی شوق سے سنا گیا۔ اس طرح اس نسائی جذبات واحساسات کے اظہار نے ایسے فنی اور فکری نقوش مرتب کیے جو آج دہائیاں گزرنے کے باوجود بھی اَن مٹ ثابت ہو رہے ہیں اور اُن ہی کا یہ شعر آج تجاہلِ عارفانہ کے درجے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

یہ کیا ہوا کہ اُس نے تکلف سے بات کی
اور میں نے روتے روتے ڈوپٹے بھگو دیے

اس حوالے سے ان کے داخلی کرب واضمحلال کو لسانی تشکیلات کی صورت میں یوں محسوس کیا جا سکتا ہے:

میں کیسے کہوں کہ اُس نے مجھے چھوڑ دیا ہے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

پروین کی شاعری کا موضوع اگرچہ خواتین کے احساسات و جذبات ہی ہیں مگر انھوں نے ان جذبات کے فنی اور تخلیقی اظہار کو نہایت ہی سنجیدہ انداز میں برتتے ہوئے ایک اعلیٰ قسم کی تانیثی جمالیات (Feminist Aesthetics) کی تشکیل کی ہے۔ پروین کے متوازی اُردو کی نسائی اور تانیثی شاعری نے ایک قابلِ ذکر سفر طے کیا تھا۔ ان کی ہم عصر شاعرات میں جو اہم اور نمائندہ نام ہیں اُن میں فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ پروین نے نسوانی مسائل و میلانات کے اظہار میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ ان کی ناکام ازدواجی زندگی کا بھرپور عکس ان کی شاعری میں قدم قدم پر جلوہ گر ہے۔ محبت کا حصول یا اس راہ کی ناکامیابیوں کا بھی اس نے ہر جگہ ذکر کیا ہے۔ مشرقی خصوصاً مسلم معاشرے میں عورت کی حدود و قیود کی اس نے بھرپور ترجمانی کی ہے۔ عورت کی بے بسی اس کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس طرح پروین شاکر کی شاعری غمِ ذات سے غمِ کائنات کے سفر پر گامزن دکھائی دیتی ہے۔ ''نِک نیم'' میں لکھتی ہیں۔

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو!
کھیلنے والے سب ہاتھوں کو گویا میں گڑیا ہی لگتی ہوں
جو پہنا دو، مجھ پہ سجے گا
میرا کوئی رنگ نہیں
جس بچے کے ہاتھ تھما دو
میری کسی سے جنگ نہیں
سوچتی جاگتی آنکھیں میری
جب چاہے بینائی لے لو
کوک بھرو اور باتیں سن لو
یا میری گویائی لے لو
مانگ بھرو، سیندور لگاؤ

پیار کرو آنکھوں میں بساؤ
اور پھر جب دل بھر جائے تو
دل سے اٹھا کے طاق پر رکھ دو
تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو۔ ۱

پروین کے ہاں نسوانی لب ولہجہ مختلف روپ میں نظر آتا ہے ان کی شاعری میں نسوانی حسیت پوری آب وتاب کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس نظم میں پروین نے بہت ہی خوبصورت انداز میں نسوانی احساسات کو شعروں میں ڈھالا ہے یہ وہ احساسات ہیں جو ازدواجی بندھن میں بندھنے کے بعد ہر مشرقی عورت خصوصاً اس معاشرے کی عورت کے ہوتے ہیں جہاں اسے اس کے بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ پروین نے عورت کے اس نفسیاتی جذبے کا اظہار بڑے دلفریب انداز میں کیا ہے جب عورت یہ سمجھتی ہے کہ میرا کوئی تشخص نہیں اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں جو اس کا حاکم اس پر حکم صادر کردے، اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں بلکہ ایک کھلونے کی طرح جسے ایک بچہ جس طرح چاہتا کھیلتا ہے، جب جی بھر گیا اُٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ عورت کے ساتھ ایسا سلوک کہ جیسے یہ ایک بے حس پتھر ہے عقل وشعور کے بغیر جس کے پاس نہ بینائی ہے نہ گویائی، فیصلے سارے اس کے تمہارے باپت ہیں۔

پیار کو آنکھوں میں بساؤ
اور پھر جب دل بھر جائے تو
دل سے اُٹھا کے طاق پر رکھ دو

اس بات سے ہر کوئی عام انسان بخوبی واقف ہے کہ مرد حاوی معاشرے میں عورت کو ایک بے رنگ شے سمجھا جاتا ہے کہ جس رنگ میں رنگ دو، رنگ جائے گی کیوں کہ اس معاشرے نے اس کو کوئی رنگ نہیں دیا۔ عورت کے ساتھ ہونے والی ان ناانصافیوں پر پروین خون کے آنسو رو رہی ہے کہ معاشرے نے عورت کی کیسی بے جان شبیہ پیش کردی ہے۔

چہرہ و نام ایک ساتھ آج نہ یاد آسکے
وقت نے کس شبیہ کو خواب و خیال کردیا

صدیوں سے عورت کو جو کچلا جارہا ہے اس سے اس کے حقوق چھینے گئے ہیں صدیوں سے عورت ان حالات میں رہ رہ کر اب وہ ایک بے جان گڑیا ہوگئی ہے اور اس بے جا ظلم کو سہہ رہی ہے۔ پروین کے الفاظ میں ہی ۔

لیکن یہ سُکھ بہت تھا کہ کچھ معتبر تو ہیں
منزل نہیں ہیں آپ کی گردِ سفر تو ہیں ۲

پروین شاکر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر مغربی ومشرقی تہذیب واقدار سے واقف ایک ایسی خاتون تھیں جس کے ہاں ہمیں خالص مشرقیت نظر آتی ہے وہ مغرب کی تانیثی تحریکات یا عورت کی اس آزادی کی خواہاں نہیں ہے جہاں عورت مرد بننے کی دوڑ میں اپنا صنفی تشخص بھی کھوتی جارہی ہے۔ اس طرح وہ مرد تو نہیں بن سکے گی مگر پھر عورت بھی نہیں رہتی۔ اپنی ایک نظم ''ورکنگ وومن'' میں لکھتی ہیں ۔

سب کہتے ہیں
کیسے غرور کی بات ہوئی ہے
میں اپنی ہریالی کو خود اپنے لہو سے سینچ رہی ہوں
میرے سارے پتوں کی شادابی
میری اپنی نیک کمائی ہے
میرے ایک شگوفے پر بھی
کسی ہوا اور کسی بارش کا بال برابر قرض نہیں ہے
میں جب چاہوں کھل سکتی ہوں
میرا سارا روپ مری اپنی دریافت ہے
میں اب ہر موسم سے سر اونچا کر کے مل سکتی ہو
ایک تناور پیڑ ہوں اب میں
اور اپنی زرخیز نو کے سارے امکانات کو بھی پہچان رہی ہوں

لیکن میرے اندر کی یہ بہت پرانی بیل
کبھی کبھی جب تیز ہوا ہو
کسی مضبوط شجر کے تن سے لپٹنا چاہتی ہے! ۳؎

اس نظم میں پروین شاکر اسلامی نظریے کی موئید دکھائی دیتی ہیں کہ ''مرد اور عورت دونوں برابر ہیں اور مرد ایک درجہ عورت سے افضل ہے'' ۴؎ کہ عورت کے پاس عزت، دولت، شہرت، نام، پیسہ، عہدہ، گھر، بچے، آزادی، خاندان یہ سارا اس کی اپنی محنت اور نیک کمائی سے حاصل کر کے بھی وہ ایک تناور شجر کا سایہ چاہتی ہے یہ تناور شجر ایک باوفا مرد کا ساتھ ہے جو ہر عورت کی فطری خواہش ہے۔ عورت مردوں کے برابر کے سارے حقوق حاصل کرنے کے باوجود بھی اس کے اندر کی یہ پرانی بیل یعنی اس کی فطرت تیز ہوا میں کسی مضبوط شجر کا سایہ چاہتی ہے مگر اس باوفا مرد کا ساتھ جس عورت کے نصیب میں نہیں ہوتا اس کی حالت اُس خشک سالی کی شکار زمین کی سی ہوتی ہے جو پانی کی ایک بوند سے اپنے وجود کو تر کرنا چاہتی ہے۔ ایسی ہی صورتِ حال کا عکس پروین کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ وسیم بیگم لکھتی ہیں:

''انھوں نے حقیقت میں کسی سے اتنی زیادہ الفت و محبت کی کہ اس پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا لیکن وہ شخص اس کا اپنا نہیں بن سکا اس نے پروین کے ساتھ بے وفائی کی اور اس بے وفائی پر نہ صرف ان کا دل ٹوٹا بلکہ ان کی روح بھی پارہ پارہ ہوگئی۔ ان کی پوری شاعری اسی درد بھرے اور ٹوٹے ہوئے دل کی آواز ہے''۔ ۵؎

پروین شاکر اپنی ایک نظم ''اے جگ کے رنگ ریز'' میں لکھتی ہیں:

اے جگ کے رنگ ریز مری اوڑھنی رنگ
دے میں نے سو سو جتن کیے پر مجھ پر روپ نہ
آیا پتی کا پیار بھی مری کایا بدل نہ پایا رہی مری
چُنری پھیکی کی پھیکی ۶؎

پروین شاکر کی چُنری کا یہ پھیکا پن اسے ہمیشہ اندر ہی اندر ستاتا رہا اور اس درد و کرب کا اظہار انھوں نے ہر جگہ کیا ہے پروین اپنے محبوب کی جفاؤں اور ظلم و ستم کے باوجود اس کی یاد اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے زمانے کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھتی ہیں ان کی شاعری میں ہر اس عورت کا کرب شامل ہے جو سماج کی ٹھکرائی ہوئی ہے جو ظلم سہتے سہتے ٹوٹ چکی ہے، مظلوم ہے، اور جس کی خواہشات نے اس کے سینے میں ہی دم دوڑ دیا ہے اور زندگی کے آخری ایام تک وہ اسی کشمکش میں مبتلا رہی مگر اپنی اس ناکام داستانِ محبت کی ذمہ دار وہ کہیں کہیں خود کو بھی ٹھہراتی ہیں۔

اور اک میں ہوں پتھر اور شوریدہ مزاج!
کاسۂ خالی میں بے وجہ سما جانے کی بجائے
اُس سے اِس وقت سے ٹکرانا چاہوں کہ
ظرفِ ہستی کی گونج سے اس کا بھرم کھل جائے!
کیوں کہ مجھ کو ایک ہزار راتوں تک جلنے والی کہانی
کہنا نہیں آتی
میں.....آقائے ولی نعمت کو
خود اپنی مرضی بھی بتانا چاہتی ہوں! ۷؎

پروین کے ان اشعار میں اس عورت کی آواز ابھری ہے جو مرد کے خود غرضانہ بنے بنائے اصولوں کو اپنا نہیں سکی وہ اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے اپنا حق چاہتی ہے جو اس کا پیدائشی ہے جو اللہ (جلہ شانہ) اور رسولؐ نے ایک عورت کو دیا ہے مگر ہمارے معاشرے کی عورت سے وہ تمام حقوق چھین لیے گئے ہیں اور جب عورت اپنے حقوق کے حصول کی کوشش کرتی ہے تو اکثر یہی ہوتا ہے کہ اس کے گھر کا شیرازہ بکھر جاتا، زمانہ اس سے خفا ہو جاتا ہے۔ پروین کہتی ہیں کہ میں شوہر کی مرضی کے مطابق چل نہ سکی، میں آقا

کوخود اپنی مرضی بھی بتانا چاہتی تھی۔ڈاکٹر فریدہ بیگم لکھتی ہیں:

''پروین شاکر اردو شاعرات میں وہ شاعرہ ہیں جنہوں نے خواتین کے مسائل اور الجھنوں کو بحسن خوبی سمجھا ہے۔ پروین کا فن عورت کی نفسیات کا فن ہے جہاں روح کی تڑپ، تنہائی کا کرب، محبوب کو پانے کی تمنا، کھو جانے پر صبر، ماضی کی دھند، قربت کا احساس، یادوں کی سبک، امید کی کرن نظر آتی ہے۔انہوں نے عورت کی ازدواجی و سماجی مسائل پر زیادہ زور دیا ہے۔ انہوں نے عورت کے ساتھ ہونے ظلم و جبر کو سنے والی خواتین کے واقعات کو اپنی نظموں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ مرد عورت کی عزت کرے اور اس کے مقام و مرتب کو پہچانے، اس کے دکھ درد میں شریک ہو کر زندگی کے نشیب و فراز میں برابر کا ساتھ دے۔ اسے اپنا ساتھی سمجھے اور حقیقت میں شریک حیات بنائے۔ اس کی قربانیوں اور صبر کی قدر کرے۔''۸

نظم ''کنیا دان'' میں وہ عورت کی بے چارگی اور بے بسی کے بارے میں لکھتی ہیں۔

گاہے گاہے جھلکتی ہوئی موہنی شکل وہ چاندسی
آئینے سے بھی نظریں ملائی نہیں جاسکتیں!
شامیانے کے پرلی طرف،
وقت کے جبر کے سامنے،
چپ کھڑی ماما
جس کے چاروں طرف
تشنہ ہونٹوں، گرسنہ نگاہوں، لٹکتی زبانوں، بدن
گیر غراہٹوں کا عجب غول ہے
اور اسی غول سے
اپنی نازوں کی پالی کی خاطر
بڑے صبر سے
ایک مجبور ہرنی کی صورت وہ چن لائی ہے
اک ذرا کم ضرر بھیڑیا!۹

سب والدین اپنی بیٹی کی ایک کامیاب اور خوشحال زندگی کے خواہش مند ہوتے ہیں جس کے لیے وہ ہر ایک جتن کرتے ہیں۔ اپنی لاڈلی بیٹی کے شریک سفر کے لیے بہتر سے بہترین کی تلاش ہوتی ہے مگر اس تلاش میں انھیں ہر طرف تشنہ ہونٹوں، گرسنہ نگاہوں، لٹکتی زبانوں، بدن گیر غراہٹوں کا عجب غول دکھائی دیتا ہے اور اس بھیڑ میں وہ ایک کم ضرر والا بھیڑیا تلاش کر لیتے ہیں۔اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی والدین اپنی لخت جگر کو ان اجنبی ہاتھوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اجنبی گھر اور لوگوں کے بیچ اس لاڈلی کی کیا حالت ہوتی ہے پروین اس کی ترجمانی اس طرح کرتی ہے۔

چلنے کا حوصلہ نہیں رکنا محال کر دیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا
ملتے ہوئے دلوں کے بیچ اور تھا فاصلہ کوئی
اس نے مگر نکلتے وقت اور سوال کر دیا
اے میری گل زمین تجھے چاہ تھی اک کتاب کی
اہل کتاب نے مگر کیا تیرا حال کر دیا
اب کے ہوا کے ساتھ ہے دامنِ یار منتظر
بانوئے شب کے ہاتھ میں رکھنا کمال کر دیا
میرے لبوں پہ مہر تھی پر میرے شیشہ رُو نے تو
شہر کے شہر کو میرا واقفِ حال کر دیا
ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی اس نے کمال کر دیا۱۰

متذکرہ اشعار یوں تو ایک عاشق کے دل کی دردمندانہ صدائیں ہیں لیکن ان اشعار میں جس نسوانی تجربے کی تجسیم کا عمل پیش کیا گیا ہے وہ اپنی انفرادیت اور فنی ہنرمندی کا مستحسن ثبوت ہے۔ بہرحال گڑیا سی یہ لڑکی کتنے حسین خواب سجائے اس اجنبی گھر میں جب قدم رکھتی ہے وہیں سے اس کے خوابوں کے ٹوٹنے کی سدا سنائی دیتی ہے اور یوں جور وظلم کی ایک عجیب وغریب داستان شروع ہوتی ہے وہ گھر کا کوئی فرد نہیں رہتی بلکہ ایک نوکر تصور کی جاتی ہے۔ گھر کے سارے کام کاج اسے سنبھالنے کے لیے کہا جاتا ہے مگر گھر کی ساری رازداریاں اس سے چھپائی جاتی ہیں عورت کو یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ جیسے وہ کوئی گری پڑی چیز تھی ہم تجھ کو کھانا کھلا کر تجھ پر احسان کر رہے ہیں۔ پھر ان حالات میں ہر شادی شدہ عورت یہی محسوس کرتی ہے۔

جس کے ماتھے پہ مرے بخت کا تارہ چمکا
چاند کے ڈوبنے کی بات اسی شام کی تھی ۱۱

ڈاکٹر فریدہ بیگم لکھتی ہیں:

''عورت محض شادی کر کے معاشی سہارا یا سماجی رتبہ تلاش نہیں کرتی بلکہ کامیاب ازدواجی زندگی چاہتی ہے۔ جہاں مرد عورت کا ایک بہترین رفیق کار ہو، اس کے دل میں عورت کے لئے مساوات، آزادی، انسانیت، دوستی محبت سارے جذبے موجود ہوں۔'' ۱۲

پروین شاکر نے خواتین کے کرب کا اظہار ہر جگہ مختلف انداز میں کیا ہے کہ عورت ہمیشہ اس سماج میں ہونے والی ان ناانصافیوں کو سہتی رہتی ہے اس کا آقا اس پر ترس نہیں کھاتا وہ اس کی دی ہوئی چھت کا بوجھ ڈھوتی رہتی ہے اور یوں ہی اپنی عمرِ عزیز کی صبح کو شام کر دیتی ہے کہ سر سے یہ چھت نہ اُٹھ جائے۔ تو کہاں جائے گھر نہ بکھر جائے تو بچوں کا کیا ہوگا۔ ''ایک اداس نظم'' میں کہتی ہیں۔

ایک طرف سہاگ ہے
اور دوسری طرف
روح کو جلانے والی آگ ہے
خود پہ برف گرتے دیکھتی رہوں
کہ روشنی کا ہاتھ تھام لوں
اے خدائے آب و نار
میرا فیصلہ سُنا
کہ زندگی کا ہاتھ تھام لُوں! ۱۳

ہمارے معاشرے میں عورت کی پوری زندگی یہی ہوتی ہے کہ میں کیا کروں؟ معاشرے میں عورت اگر ظلم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے، احتجاج کرتی ہے اس مرد حاوی معاشرے میں اس کو انصاف تو نہیں ملتا ہے بلکہ اس کا خمیازہ اسے مختلف صورتوں میں بھگتنا پڑتا ہے۔ شوہر یا سسرالی رشتے کے ذریعے سے ہونی والی ناانصافیوں سے اگر وہ نبرد آزما ہوگی تو اس کے نتائج بہت سخت ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہنا تو زندہ دفن ہونے کے مترادف ہے اور زندگی کا ہاتھ تھام لے اندھیروں سے نکل کر روشنیوں کی طرف جائے تو نئے مسائل جنم لیتے ہیں اے خدا آب و نار میرا فیصلہ سنا۔

پروین شاکر اپنی نظم ''ایک معقول نکاح'' میں اس طرح کے جذبات واحساسات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں۔

تو فی الوقت مہر مؤجل ہی کافی ہے
فکر معجّل تو تب ہو
کہ مطلوبہ ویرانیاں مشتبہ ہوں
غم کا موضع
اداس کی تحصیل
تنہائی کا پرگنہ
مری عمر بھر کی کفالت کو کافی رہیں گے
مرے بوم نر صاحب بارگاہِ حماقت

قاضی شاہ بہرام کو حکم ہو
صیغۂ عقد پڑھ! ۱۴

پروین شاکر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر اسلامی تعلیمات سے بھی واقف تھیں عورت کا نان و نفقہ جو نکاح کے بعد اسلام نے مرد (شوہر) پر فرض کیا ہے پھر مرد اس ذمہ داری کو کیسے نبھاتا ہے اور شادی شدہ عورت کی زندگی کیسے گزرتی ہے مرد کے ذریعے سے عورت کو پھر کیا کچھ ملتا ہے ؟ پروین لکھتی ہیں تمھیں مہر کی فکر کیوں پڑی ہے تم مجھے مہر کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ دو گے۔ غم، اداسی اور تنہائی مری عمر بھر کی کفالت کو کافی رہیں گیں۔ یہی چیزیں پھر عورت کا اوڑھنا اور بچھونا بن جاتی ہیں۔ اس کے دن رات انھیں حالات سے گزرتے ہیں۔ مرد ہمیشہ خود کو عورت کے زلفوں کا اسیر ٹھہراتا ہے مگر حقیقت میں قیدی عورت ہوتی ہے وہ جب بھی اپنے حقوق کا حصول چاہتی ہے اسے گھر سے نکالا جاتا ہے، مامتا اسے روک لیتی ہے، معاشرہ اسے طعنے دیتا ہے، رشتے اسے قبول نہیں کرتے وہ صرف تب تک دلپذیر ہے جب تک وہ اشاروں پہ چلے تو اس کے ہاتھ چومے جائیں گے۔ اس کی واہ واہ ہوگی وہ حکم کی تعمیل نہ چاہتے ہوئے بھی کرتی جائے تو یہ سننے کو ملے گا:

تعجب تو یہ ہے کہ اپنے سماجی فرائض میں اس درجہ مصروف رہنے کے باوصف آپ اتنے گھٹنے کچن میں رہیں
اتنا بہت کچھ! پھر اتنا مزیدار کھانا پکانا!
ہمیں تو کوئی معجزہ ہی لگا
اس پہ حیران کن بات یہ ہے
کہ اتنی تھکن پر
جبیں اور ساری پہ کوئی شکن نہیں آئی

اس ڈنر کے مقابل میں بیگم فلاں کا ڈنر کچھ نہ تھا! ۱۵

مرد ہمیشہ عورت کی خوشامد کر کے اس سے اتنا کچھ کراتا ہے جو وہ جانتا ہے کہ اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے یہ نظم اس عورت کی مکمل تصویر پیش کر رہا ہے جو کسی ادارے کی ملازمہ بھی ہے اور گھر میں بیوی اور ماں بھی ہے پورے گھر کا نظام چلاتی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح یہ صنفِ نازک یہ سب کچھ انجام دے رہی ایک مشین کی طرح جیسے جا رہی ہے ایک معجزہ ہی لگ رہا ہے۔ اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود اسے یہ سُننے کو ملتا ہے اس ڈنر کے مقابلے میں بیگم فلاں کا ڈنر کچھ نہ تھا۔ ہر بیگم فلاں اپنا پورا دن گھر گرہستی اور کہیں کہیں دفتر کے کاموں میں گزارتی ہے مگر اگر کہیں چھوٹی سی کمی یا کوئی خامی رہ گئی تو یہی سننے کو ملتا ہے کہ بیگم فلاں کو دیکھو اس کا حسن، اس کا گفتار، اس کا کردار، سلیقہ شعاری تم تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہو۔ ڈاکٹر مشتاق وانی اپنی کتاب ''اردو ادب میں تانیثیت'' میں لکھتے ہیں:

> ''پروین شاکر کے کلام میں نسوانیت کی وہ چیخ سنائی دیتی ہے جو ایک غیر مطمئن روح بھری ہے۔ انسانی معاشرے کی ایک عام خاتون جو خاندانی نظام کی رسموں، رواجوں اور رشتوں میں بندھی ہے۔ پرسکوں ازدواجی زندگی جینے کی تڑپ میں یہ خاتون اکثر کوششوں کے باوجود ناکام ہوتی ہے۔ یہی نا آسودگی اور حالت اضطراب پروین کی نظموں میں بار بار ابھرتی ہے۔'' ۱۶

پروین شاکر اُردو ادب کی وہ شاعرہ ہیں جس نے ہمارے معاشرے کی خواتین کے لگ بھگ تمام احساسات و جذبات کو ارتکازِ فکر کے ساتھ بھرپور انداز میں پیش کیا اس کے ساتھ کہاں کہاں اور کس کس طرح کیا ہو رہا ہے وہ کس طرح صدیوں سے یہ سب کچھ سہہ رہی ہے؟ پروین نے اس نسوانی کرب کو بہت

ہی دلپذیر انداز میں بیان کیا ہے کیونکہ ان کی پوری ازدواجی زندگی انہی اذیت ناک حالات سے گزری ہے۔اپنی ایک نظم ''کتبہ'' میں کہتی ہیں ؎

یہاں پہ وہ لڑکی سو رہی ہے
وصال کی عمر رت جگے میں گزار دی تھی
عجیب تھا انتظار اس کا
کہ جس نے تقدیر کے تنک حوصلہ مہاجن کے ہاتھ
بس ایک دریچۂ نیم باز کے سُکھ پہ
شہر کا شہر رہن کروا دیا تھا
لیکن وہ ایک تارہ
کہ جس کی کرنوں کے مان پر
چاند سے حریفانہ کشمکش تھی
جب اس کے ماتھے پر کھلنے والا ہوا
تو اس پل
سپیدۂ صبح بھی نمودار ہو چکا تھا
فراق کا لمحہ آ چکا تھا!۱۷

OOO

حوالہ جات:

۱۔ ''نِک نیم'' از پروین شاکر مشمولہ شعری مجموعہ صد برگ، فرید بک ڈپو، دہلی ۲۰۱۲ء، ص۔۷۷

۲۔ ''خاکم بدہن''، از پروین شاکر، مشمولہ صد برگ، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۔۹۶

۳۔ ''ورکنگ وومن''، از پروین شاکر، مشمولہ صد برگ، فرید بک ڈپو، ۲۰۱۲ء، ص۔۱۱۳

۴۔ بحوالہ سورہ ''بقرہ'' آیت نمبر ۲۲۸

۵۔ آزادی کے بعد اُردو غزل، ڈاکٹر وسیم بیگم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۵۰۶

۶۔ ''اے جگ کے رنگریز''، از پروین شاکر، مشمولہ صد برگ، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۔۱۷۹

۷۔ ''تو برمن بلا شدی''، از پروین شاکر، مشمولہ صد برگ، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۔۱۸۸

۸۔ بیسویں صدی میں اُردو شاعری، ڈاکٹر فریدہ بیگم، ایم ایم پبلی کیشنز، دہلی، ص۔۸۸

۹۔ ''کنیا دان'' از پروین شاکر، مشمولہ صد برگ، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۲ء، ۲۰۰

۱۰۔ مشمولہ کفِ آئینہ، از پروین شاکر، مشمولہ صد برگ، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۔۱۳۔۱۲

۱۱۔ مشمولہ صد برگ۔ص۔۲۲۰

۱۲۔ بیسویں صدی میں اُردو شاعری، ص۔۸۸

۱۳۔ ''ایک اداس نظم''، مشمولہ صد برگ، ص۔۲۵۹

۱۴۔ ''ایک معقول نکاح''، مشمولہ صد برگ، ص۔۲۶۰

۱۵۔ ''پوسٹ ڈِنر آئیٹم''، مشمولہ صد برگ، ص۔۲۷۱

۱۶۔ اردو ادب میں تانیثیت، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ۲۷۹

۱۷۔ ''کتبہ''، مشمولہ صد برگ، ص۔۲۷۸

رعائتی نرخ پر

ادیبوں وشاعروں کی کتابوں کے اشتہارات ''سب رس'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

مضمون

محمود شیخ

خورشید حیات کی کہانیوں کا فکری محور

یہ دنیا فکر وفن کا بازار ہے، جہاں ہر ضرورت اور موقع کے مطابق ریڈی میڈ خیالات دام دے کر خریدے جا سکتے ہیں- فلسفی اور فنکار، صارفین کو جدید اخلاقی نظریات، فن وفلسفہ، اپنی اپنی قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں- جذبہ، احساس وخیال یہاں سبھی کچھ برائے فروخت موجود ہے- مشرقی اخلاقی قدریں، عشق جنوں خیز اور اخلاص کی قیمت کچھ بھی نہیں- یہ سب آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکا ہے- جنسی آزادی اور عریانیت کے دام لگتے ہیں- سنسیکس فیگر کی طرح ان کا بھاؤ بھی اترتا چڑھتا رہتا ہے-

ہمارے یہاں تو کوئی ڈارک ایج جیسا اندھا کنواں بھی نہیں کہ اپنی درخشاں روایتیں اسے سونپ کر ایک نیا ٹیسٹامنٹ تیار کر سکیں- کوئی کولونیالزم بھی نہیں کہ جس کے ذریعہ دولت سمیٹ کر ایک نیا جہاں آباد کیا جا سکے- ممکن ہے اکیسویں صدی میں نوآبادیاتی نظام کا کوئی نیا متبادل وضع کرنے میں ہم بھی کامیاب ہو جائیں-

مہاراجہ بھرتر ہری نے کہا تھا، بہادر مرد، خوبصورت اور عالم دنیا میں جہاں بھی جائیں گے، ان کی عزت کی جائے گی- مگر آج اس خیال کو یوں دیکھا جا رہا ہے، چالاک مرد، بے حیا عورت اور تاجران وقت دنیا میں جہاں بھی جائیں گے، ان کی قیمت ادا کی جائے گی- کیا ہمارا ذہن وکردار، شعور واحساس، ادب وتہذیب، سائنس اور ٹیکنالاجی کی طرز پر ترقی یافتہ ملکوں سے درآمد کیا جائے گا ؟ یہی وہ کرب تخلیق ہے جو آج مختصر کہانیوں کی شکل میں "ایڈز" عنوان سے ہمارے سامنے موجود ہے-

خورشید حیات کا تخلیقی فن وشعور، تہذیبی اور تمدنی یافت کی وہ ابتدائی منزل ہے جہاں سے اکیسویں صدی کا سفر شروع ہوتا ہے، اور آج میں خود بھی ان کے ہمراہ شریک سفر ہوں- ان کے سبھی افسانے مشرقی اقدار حیات، شعور واحساس کے ترجمان ہیں-" ایڈز" کا موضوع محتاج تعارف نہیں- ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرح یہ بیماری روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے- ممکن ہے نئی صدی کو "ایڈز صدی" کے نام سے یاد کیا جائے- وجہ یہ ہے کہ حرص وہوس نے جسم کے اندرون کی طاقت بھی چھین لی ہے- اس مسئلہ کی صراحت " طوفان سے پہلے اور طوفان کے بعد" میں یوں کی گئی ہے کہ، مغرب کی جانب سے آسمان میں سیاہ بادل امنڈ آئے اور تاریکی چھا گئی، مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں" آگے کا راستہ ابھی کھلا ہے بند نہیں-"

"لفظوں کی موت" میں قدیم وجدید نظریات فکر کو نشانہ بنایا گیا ہے " تمہارے دادا کے بیٹھنے کا جو چبوترہ تھا وہ ان کی آئیڈیالوجی کی قبر کی صورت اختیار کر چکا ہے-" بابا" کا مرکزی کردار اسی آئیڈیالوجی کی قبر میں دفن ہے- مصنف بڑی الجھن میں ہے، وہ سمجھ نہیں پا رہا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی روشنی، بابا کی مردہ ہڈیوں کا سحر ہے یا کوئی حقیقت- "چلتی رکتی گاڑی کے بیچ"، نئی تعلیم وتربیت کا المیہ ہے- تعلیم یافتہ نئی نسل کو بھکاری بنا دیا گیا ہے-" دائروں کا قیدی" اپنی قسمت کی چہار دیواری سے باہر نکل کر دنیاوی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے- مگر اپنے دائروں کا اسیر بھی ہے- نئی تہذیب ایک ان دیکھی آگ کی مانند پھیلتی جاتی ہے اور اب تو " آگ لگنے کے بعد" آدمی کا مقصد زندگی جلنا اور جلانا ہی رہ گیا ہے -" سوالیہ نشان کے نیچے کا نقطہ ؟" ستیہ اور اہنسا کی ایک نئی توجیہی دریافت ہے-" نروان" مذہبی نظم حیات سے پیدا شدہ تعطل کے خلاف تجزیاتی فکر وفہم کا مطالبہ کرتی ہے-" وقت کے احاطے میں"

ماضی و حال کی کشمکش سے دو چار مصنف کا قلم اس کے ہاتھوں سے کیوں گر جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب قاری اپنی بصیرت کے مطابق تلاش کریں گے- " خبر ہونے تک " کا موضوع حالانکہ، انسان ہی ہے مگر بے دست و پا، ایسا کیوں ہے؟" کشکول " مسخ شدہ ذہن کے کھوکھلے آدرش واد کے خلاف مصنف کے احتجاجی رویے کا مظہر ہے- اسکی نظر میں ذہن انسانی گداگر کے پیالے کی طرح خالی ہے- اسے تعمیری اقدار حیات کی خیرات چاہئے- لیکن مفلوک الحال اور تہی دست آدمی کے پاس ہے کیا، جو وہ خیرات کر سکے؟- "انگلیوں کا رقص اور آنکھیں" فکر و اقدار سے محروم انسان کی بصیرت پر خورشید حیات کے احتجاجی رویئے کا مظہر ہے - " کرچیاں اور فریم " حصار ذات سے باہر آنے اور آزادی کی جستجو میں چھٹپٹاتے انسان کی ذہنی کیفیتوں کا ترجمان ہے- " انسانیت کے دشمن " فسادات کے خلاف ایک حساس فنکار کے احتجاج کو ظاہر کیا گیا ہے-

دراصل صالح فطرت انسان، مقصد کے بغیر زندگی اور کائنات کا تصور بھی نہیں کر سکتا - ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر شے کا ایک دائرہ عمل مخصوص ہے- حالانکہ مشرقی تصورات و خیال کی غیر مرئی حقیقتیں دلائل و شواہد سے زیادہ یقین اور اتباع پر قائم ہیں - لہٰذا نظریات فکر و عمل میں اعتدال و توازن کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے- یہی احساس خورشید حیات کی کہانیوں کا فکری محور ہے، جس کے اطراف جدید تہذیب و تمدن سے پیدا شدہ نفسی مسائل گردش کرتے ہیں-

ٹالسٹائے، خلیل جبران اور رابندر ناتھ ٹیگور کے یہاں انسانی زندگی کی عرفانی صداقتوں کا بیان ملتا ہے- رومی اور شیخ سعدی کی حکایات. جاتک کتھائیں، کتھا سرت ساگر. پنچ تنتر کی کہانیاں، عظیم اخلاقی وراثتوں کی امین ہیں - اس لئے میں سمجھتا ہوں ، حقیقت پسندی اور نفسیاتی بیانیہ کی آویزش سے خورشید حیات نے عظیم مشرقی روایتوں کو از سر نو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے-

OOO

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔٦

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔٨٢

مضمون

عریشہ تسنیم

نیر مسعود کے افسانوں میں جادوئی حقیقت نگاری کی بازگشت

نیر مسعود ایک اعلیٰ درجہ کے محقق، نقاد، مترجم اور افسانہ نگار تھے۔ مرثیہ خوانی کے فن پر بھی انھوں نے جامع مقالہ لکھا ہے جو ان کی تحقیقی بصیرت اور تجزیاتی صلاحیت کا پتا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ میر انیسؔ کی سوانح پر ان کی تصنیف کردہ کتاب نہایت عمدہ تخلیق مانی جاتی ہے۔ انھوں نے فارسی اور دیگر زبانوں کے افسانوں کے بھی قابل قدر ترجمے کیے ہیں۔ نیر مسعود نے مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی ادبی تخلیق پر مغربی اقدار کے نمایاں اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

تخلیقی میدان میں ان کی لکھی کہانیوں کی تعداد تقریباً پچاس ہے۔ ان میں سے 33 کہانیاں ان کے افسانوی مجموعوں سیمیا، عطر کافور، طاؤس چمن کی مینا اور گنجفہ میں شامل ہیں۔ باقی کہانیاں مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئی ہیں۔ یہ کہانیاں گہری معنویت رکھتی ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے پر نیر مسعود کی علمی بصیرت اور ان کے فن کی انفرادیت پر حیرت ہوتی ہے۔ ان کے کچھ افسانوں کے پس منظر میں انگریزوں کی حکومت کے دوران لکھنؤ کی گرتی معاشی، معاشرتی، تہذیبی وثقافتی پہلوؤں کی جھلک بھی ملتی ہے اور اسی لیے ان کے افسانے ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ نیر مسعود کو ان کی فنکاری اور مختلف ادبی خدمات کے لیے ملکی اور غیر ملکی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ جن میں سرسوتی سمان ایوارڈ اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ شامل ہیں۔ وہ اسی سال 24 جولائی کو طویل علالت کے بعد 81 سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

نیر مسعود کے افسانوں کو ہندوستان میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے کہیں زیادہ بیرون ممالک میں ان افسانوں کو موضوع بنا کر چھوٹے بڑے کئی مقالے ومضامین لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے قابل تحسین مضمون محمد عمر میمن کی ہیں۔ انھوں نے ان کے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ Elizabeth Bell، محمد سلیم الرحمٰن، زینو (صفدر میر) کی تحریریں بھی نیر مسعود اور ان کے فن سے متعلق ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''عطر کافور'' کی کہانیوں کے انگریزی ترجمے بنام Essence of Camphor کی اشاعت 2000ء میں ہوئی۔ اس کی اشاعت کے بعد امریکہ، برطانیہ، اسپین، فرانس، اور اسرائیل کے اشاعتی اداروں نے بھی ان کی کہانیوں میں دلچسپی لی۔ بین الاقوامی ادبی معاشرے میں ان کے افسانوں کی طرف خاصی توجہ اور مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے نیر مسعود کی مخصوص ادبی شخصیت کی غمازی کرتے ہیں۔

نیر مسعود اپنے افسانوں پر بہت توجہ دیتے تھے اس لیے ان کے افسانے فن کے اعتبار سے بڑے معیاری ہوتے ہیں۔ مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور الفاظ عام فہم ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانے قواعد وساخت کے اعتبار سے بھی مسلم ومکمل ہیں۔ ماحول وحالات کے اعتبار سے الفاظ کی چیدگی نہایت برجستہ اور عمدہ ہے۔ ان کے افسانوں میں نہ عشق کی حدت ہے نہ حسن کا جادو، نہ دل فریب مناظر ہیں نہ پھولوں کی مہک، نہ جذبات کی شدت ہے نہ دل کو چاک کر دینے والے آہ وفغاں۔ افسانوں میں بیانیہ بالکل معروضی ہیں۔ لیکن ان کے افسانوں میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو پڑھنے والے کو ایسا مسحور کرتی

ہیں کہ افسانے کا آخری صفحہ تک پڑھے بغیر اسے چین نہیں آتا۔ افسانے خواب ناک، مبہم اور ہلکی خوف کی چاشنی لیے ہوتے ہیں جو قاری پر جادوئی اثر پیدا کر کے خوابوں کی دنیا کی سیر کراتے ہیں وہاں ہلکے خوف کے ساتھ ایک عجیب سناٹا ہوتا ہے۔ ماحول میں ایسی ویرانی جیسے روحوں کی دنیا ہو یا صدیوں پرانے کسی زمانے کا مقام ہو۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان میں ایسے رمز و اشارات اور قدرت، انسان کی تخلیق، موت و حیات، انسانی فطرت و جذباتی کشمکش سے متعلق فلسفے ہیں جو انسان کے شعور کو کریدتے ہیں اور زندگی کو منفی انداز میں دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کے تقریباً سبھی افسانوں کے پلاٹ (Deep structure) میں موضوعی وحدت فنی ہنرمندی کے ساتھ موجود ہوتا ہے جو کسی نہ کسی انداز میں انھیں فلسفوں کی ترجمانی کرتا ہے۔

نیر مسعود کے بعض افسانوں میں جادوئی حقیقت نگاری کا مشاہدہ ہوتا ہے جو ان کے افسانوں کو زیادہ موثر بنانے کے ساتھ ساتھ ان میں بھول بھلیاں جیسی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ جادوئی حقیقت نگاری (میجکل ریلزم) اور علامتی افسانے دراصل مغربی فنکاروں کی دین ہیں۔ اردو ادب میں بھی کچھ مصنفوں نے میجکل ریلزم کو اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کی ہے جن میں نیر مسعود کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے۔ جادوئی حقیقت نگاری لاطینی امریکہ کے جدید فکشن کے حوالے سے ادب میں رائج ہوئی۔ یہ دراصل تمثیلی، استعاراتی، علامتی وغیرہ کی طرح فکشن کی کوئی قسم نہیں ہے بلکہ فکشن کی حقیقی بیانیہ میں غیر حقیقی یا غیر منطقی واقعات یا وقوعات کی ایسی آمیزش ہے جو جادو کی طرح عقل کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ جادوئی حقیقت نگاری میں غیر منطقی یا غیر حقیقی باتیں حقیقت کا جزو بن کر مصنف کا اصل مقصد اجاگر کرتی ہیں۔ بالفاظ دیگر کسی شئے کا جادو کی طرح حیران کن طریقے سے کسی اور شئے میں مبدل کر دینا اور اس سے اصل مفہوم کو اجاگر کرنا جادوئی حقیقت نگاروں کا بنیادی فن ہوتا ہے۔ اس طرح جادوئی حقیقت نگاری کا فنی مفہوم یہ ہے کہ بظاہر حقیقی فن پارے میں بیانیہ کے توسط سے کوئی غیر متوقعہ یا بعید از قیاس پہلو داخل کر دیا جائے۔ تاہم بیان معروضی ہی رہے۔ نیز مبالغہ اور رنگ آمیزی کا گمان بھی نہ گزرے۔ بیان کی یہ نوعیت حیرت کے ساتھ خوف کا عنصر بھی پیدا کرتی ہے۔ اس تکنیک میں قول محال کا استعمال کہانی میں بھول بھلیاں جیسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ بعض نقادوں کے مطابق ارجنٹائنا کے فکشن نگار بورخیس کی کتاب "A Universal History of Infamy" سے فکشن میں جادوئی حقیقت نگاری کی ابتداء ہوئی۔ اس کے بعد اس کے ہم عصر لاطینی فکشن نگاروں کے ذریعہ یہ افسانوی تکنیک اپنے عروج کو پہنچی۔ ان میں گارسیا مارکیز کا شہرۂ آفاق ناول ''تنہائی کے سو سال'' جادوئی حقیقت نگاری کی سب سے بین مثال ہے۔ اردو ادب میں نیر مسعود کے علاوہ سریندر پرکاش، اقبال مجید، خالد جاوید، خالدہ حسین وغیرہ نے بھی اپنے افسانوں میں جادوئی حقیقت نگاری پر طبع آزمائی کی ہے۔ نیر مسعود کے کچھ افسانوں میں میجکل ریلزم کا بخوبی مشاہدہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباسات میں میجکل ریلزم کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے:

i۔ ''اچانک مجھے محسوس ہوا کہ مٹی میں سے کافور کی ہلکی سی لپٹ شعلے کی طرح اوپر لپکی اور غائب ہوگئی۔ میں نے ہتھیلی کو اپنے نتھنوں کے قریب کر کے ایک سانس لی، لیکن مجھے کوری مٹی کی ٹھنڈی خوشبو کے سوا کچھ محسوس نہ ہوا۔'' (عطر کافور، صفحہ:130)

ii۔ ''اس کی نظر اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھی

لیکن یقیناً میں اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔''
(سیمیا،صفحہ:174)

iii۔''میں نے سب سے پہلے زہر مہرے کا عمل اپنے ہی اوپر دیکھا یا اب مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔''
(مارگیر،صفحہ:65)

iv۔''ویسی ہی معلوم ہوتی ہے'' وہ اوپر دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی اوپر دیکھا۔ ہمارے سروں کے اوپر ایک پرندہ منڈلا رہا تھا اور سفید ڈورا اس کے ساتھ ساتھ گردش کر رہا تھا۔ یہ ڈورا کیسا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہیں سے لائی ہوگی، میرا ساتھی بولا، گھونسلہ بنانے کے لیے۔ پرندہ کچھ نیچے ہوکر پھر چکر کھاتا ہوا اوپر اٹھا۔''(عطر کافور،ص:124)

v۔''میں تمہیں وہی چیز دکھانے لایا تھا جو موجود نہیں ہے۔''(سیمیا،صفحہ:178)

vi۔''اگلے موڑ پر اس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی اس کے بعد درختوں اور ٹیلوں کے درمیان وہ بار بار نظر آتا اور غائب ہوتا رہا اور اب ہر جھلک کے ساتھ اس کی شائستگی نمایاں ہورہی تھی اور ہر جھلک کے ساتھ اس کی کہنگی دور ہورہی تھی۔'' (سیمیا، صفحہ:174)

vii۔''دھوپ میں تیزی آ گئی تھی اور اب کچی سڑک کے آثار بھی ختم ہو گئے تھے، البتہ گرد آلود پتیوں والے درختوں کی دو رویہ مگر ٹیڑھی میڑھی قطاروں کے درمیان اس کا تصور کیا جا سکتا تھا، لیکن اچانک یہ قطاریں میں اس طرح منتشر ہوئیں کہ سڑک ہاتھ کے پھیلے ہوئے پنجے کی طرح پانچ طرف اشارہ کر کے رہ گئی۔ یہاں پہنچ کر میں تذبذب میں پڑ گیا۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے بہت دیر نہیں ہوئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں اپنے محلے سے بہت دور نہیں ہوں، پھر بھی میں نے وہاں پر ٹھہر کر واپسی کا راستہ یاد کرنے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گرد آلود پتیوں والے درخت اونچی نیچی زمین پر ہر طرف تھے۔ میں نے ان کی قطاروں کے درمیان سڑک کا تصور کیا تھا لیکن وہ قطاریں بھی شاید میرے تصور کی پیداوار تھیں، اس لیے کہ اب ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔''(مراسلہ،صفحہ:16)

viii۔''میں نے اپنے کئی کئی بار کے دیکھے ہوئے مکانوں کو دوبارہ جا کر دیکھا اور مجھے ہر مکان میں خوف اور خواہش کا ایک ایک ٹھکانہ ملا۔ کوئی مکان ان ٹھکانوں سے خالی نہیں تھا۔ خواہ وہ نیا ہو یا پرانا، یا ایک ہی وضع کے بنے ہوئے سینکڑوں مکانوں میں سے ایک ہو۔ خوف اور خواہش کے ان ٹھکانوں کو دریافت کرنا میرا مشغلہ بن گیا اور ایسا مشغلہ کہ اس سے میرے کام کو نقصان پہنچنے لگا۔ (اوجھل، صفحہ:22)

ان اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ نیر مسعود

کے افسانوں کے کینواس پر میجکل ریلزم کی جابجا کار فرمائی ہے۔ان کے افسانوں کو مبہم خوف کی فضا لیے اور خواب ناک بنا دیتے ہیں۔

نیر مسعود کے افسانوں میں موجود میجکل ریلزم پر گفتگو کرتے ہوئے مہدی جعفر نے اپنی رائے اس طرح ظاہر کی ہے:

''ان کے افسانے ''کافکا'' اور ''پو'' جیسے فن کاروں سے قریب مگر ''جوائس'' وغیرہ کی فن کاری سے فاصلے پر ہیں۔ ان کے چند افسانوں میں میجک ریلزم کی کارفرمائی ہے۔ دیوندر اسر کی حقیقت پر مبنی Magic Realism کے برخلاف نیر مسعود کی میجک ریلزم خواب ناک علامتوں پر استوار ہے۔ جب کہ سریت دونوں کے یہاں موجود ہے۔ نیر مسعود کا فن اتنا محدود نہیں ہے کہ وہ محض لکھنؤ کے زوال کا المیہ رقم کریں۔ دراصل وہ فنا کا افسانہ لکھتے ہیں۔ صاف اور لطیف زبان کے باجود نیر مسعود کے افسانے قارئین کے لیے پیچیدہ ہیں۔'' (افسانہ بیسویں صدی کی روشنی میں،ص:56,57)

الغرض نیر مسعود کے سلسلے میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے منفرد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں واقعیت اور زماں و مکاں کی مروجہ تعریف سے انحراف کرتے ہوئے جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیک کو فنی شعور کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ یہ ان کی علمی بصیرت کی پختگی کا ثبوت ہے۔ فی الوقت اردو ادب میں نیر مسعود جیسے افسانہ نگار خال خال نظر آتے ہیں۔ان کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نیر مسعود زمانے سے آگے تھے۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ نیر مسعود کے افسانوں کی تہہ میں جا گزیں بیشتر نوش واستعارات کو عام قاری نہیں سمجھ پاتا۔ بہر حال چونکہ ارتقاء، نظام قدرت کا بنیادی اصول ہے اس لیے اردو کی تحقیق وتنقید بھی وقت کے ساتھ ارتقائی منازل طے کریں گی۔ اس کے ساتھ انسانی فکر میں نئی نئی شاخیں نکلیں گی، مختلف نظریات سامنے آئیں گے اور نئے نئے رجحانات پیدا ہوں گے۔ تب عام قاری کے لیے ان نقوش واستعارات کو سمجھنے میں موجود میجکل ریلزم کے نکات کی تفہیم میں زیادہ آسانی ہوگی۔

OOO

حوالہ جات

i۔ عطر کافور،ص:130

ii۔ مراسلہ،ص:16

iii۔ سیمیا،ص:174

(iv) نیر مسعود کی افسانوی واہمہ سازی ص:283

(v) افسانہ بیسویں صدی کی روشنی میں،ص:56,57

(vi) رسالہ سوغات، مارچ،1993

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات "idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع

یادیں

آج کا دن بہت مبارک دن ہے۔ دعائیں مانگ کر اور دے کر سب رس کی یہ قسط شروع کر رہی ہوں۔

''تم سلامت رہو ہزار برس''

یہ دعا میں نے مانگی ہے۔ شہزادہ والا شان نواب مکرم جاہ بہادر کے لیے۔ وہ ۶/اکتوبر ۱۹۳۳ء بروز جمعہ جنوری فرانس کے ایک شہر نائس میں پیدا ہوئے۔ شہزادی دُرشہوار (پرنس آف برار) نے ریاست حیدرآباد کو ایک ولی عہد دیا۔ ان کے نانا سلطان عبد المجید نے ''مجیدی پاشا'' کا نام دیا تو آصف سابع، نومولود کے دادا نے میر برکت علی خاں مکرم جاہ بہادر کا خطاب دیا۔ ان کی عمر جب چھ ماہ کی ہوئی تو انہیں حیدرآباد لایا گیا۔ اس دن گھر گھر جشن کا ماحول تھا۔ شہر بھر چراغاں، گھر گھر روشنی تھی پٹاخے چھوڑے جا رہے تھے۔ مسجدوں میں شکرانے ادا کیے گئے۔ مندروں میں پوجا کی گئی۔ شاہی پیالس میں بندوقیں سر کی گئیں۔ ان کی تشریف آوری کا حیدرآباد کو بڑا انتظار تھا۔ مدرسوں میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔

پرنسس دُردشہوار اور پرنسس نیلوفر کی آمد سے حیدرآباد کے وقار اور خوب صورتی میں مزید اضافہ ہوا۔ ۱۲/نومبر ۱۹۳۱ء کو نواب میر حمایت علی خاں بہادر میجر جنرل والد شان اعظم جاہ بہادر ہز ہائنس آف برار ولی عہد سلطنت کی شادی شہزادی دُرشہوار سے ہوئی اور اسی دن نواب میر شجاعت علی خاں والا شان معظم جاہ بہادر کی شہزادی نیلوفر سے Nice میں ہوئی تھی۔ دونوں شہزادیاں ترکی سلاطین کے اعلیٰ تمدن کا بہترین اور قابل فخر نمونہ تھیں۔ استنبول سے بذریعہ پانی کا جہاز ہندوستان ممبئی آئیں وہاں سے ٹرین سے نامپلی حیدرآباد پہنچیں۔ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف سابع نے پروٹوکال توڑ کر نامپلی اسٹیشن، شہزادیوں کے استقبال کے لیے پہنچے ان کے پیچھے پورا کورٹ دست بستہ کھڑا ہوا تھا۔ جب شہزادیاں ٹرین سے اتریں تو اعلیٰ حضرت بے حد خوش تھے۔ آصف سابع نے شہزادی دُرشہوار کو ہمیشہ اپنے سے قریب رکھا اور ان سے اکثر اوقات مشورے بھی لیا کرتے تھے۔ وہ بڑی قابل خاتون تھیں وہ ایک بہت بڑے ملک سے آئی تھیں انہیں سیاست کا خاصا تجربہ تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ حیدرآباد خوب ترقی کرے۔ دونوں شہزادیوں نے حیدرآبادی پہناوے کے مطابق ساریاں پہننا شروع کیا۔ سر پر ہمیشہ پلو اوڑھے رہتی تھیں۔ کالجس اور اسکولوں کے جلسوں میں بہ نفس نفیس شریک ہوتیں۔ تقسیم انعامات کے جلسوں میں ان کے دست مبارک سے لڑکیاں انعامات لے کر فخر کرتی تھیں۔ ان کی آمد حیدرآباد کے لیے ایک فال نیک ثابت ہوئی۔ ان سے پہلے کبھی شاہی خاندان کا کوئی فرد شہزادے اور شاہ پبلک میں نہیں آتے تھے۔ اسکول اور کالجس میں لڑکیوں کی ڈریسنگ بدلنے لگی۔ محبوبیہ میں امراء کی لڑکیاں کھڑے ڈوپٹے میں آتی تھیں۔ دیگر لڑکیاں کرتا پاجامہ اور اوڑھنی پہن کر آتی تھیں۔ پردہ نشین خواتین میں بھی تبدیلیاں آئیں انہوں نے بھی ساڑیاں پہننا شروع کیا۔ پڑھی لکھی خواتین علمی ادبی اور سماجی جلسوں میں شرکت کرنے لگیں۔ ان کی انجمنیں قایم ہوئیں وہ دھواں دھار تقریریں کرنے لگیں۔ باہر سے آنے والے شاہی مہمان وائسرائے اور یورپین آفیسر سے شہزادیاں ملتیں خاص طور پر شہزادی دُرشہوار اور شہزادہ والا شان اعظم جاہ بہادر مہمانوں سے ملاقات کرتے تھے۔ پرنس اعظم جاہ اور شہزادی دُر شہوار کا بلاوسٹہ میں قیام تھا شہزادی نیلوفر اور پرنس معظم جاہ ہل فورٹ

پیالس میں رہتے تھے۔ان دونوں شہزادیوں نے حیدرآباد میں کئی فلاحی کام کیے۔طب،تعلیم اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔سرکار کے ساتھ برابر کھڑی رہتی تھیں جنگ کے زمانے میں ایڈ کراس اس کے لیے ریزیڈنٹ کے ساتھ مل کر کئی کام کیے۔ یہ دونوں معزز خواتین تعلیم یافتہ تھیں، بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا پروٹو کال جانتی تھیں۔ان سے ہماری نئی نسل کو بہت بڑھاوا ملا۔لڑکیوں میں تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔

پرنس مکرم جاہ بہادر کی پرنسس اسریٰ سے ملاقات استنبول میں ہوئی اور شادی لندن میں۔ پرنس ہی نے پرنسس اسریٰ کو Propose کیا۔منگنی میں مکرم جاہ نے شہزادی کو ایک بہت ہی قیمتی زمرد کی انگوٹھی پہنائی۔ یہاں حیدرآباد میں نظام سابع دادا نے اپنے پوتے کے لیے کسی کو پسند کر رکھا تھا۔ پرنس کو یہ ڈر تھا کہ اعلیٰ حضرت کہیں حیدرآباد میں پکڑ کر ان کی شادی نہ کر دیں۔اس لیے انھوں نے لندن ہی میں شادی کر لی۔اس میں نہرو جی کا بڑا ہاتھ تھا۔وہ چاہتے تھے کہ پرنس کی شادی اسریٰ سے ہی ہو۔شادی کے بعد پنڈت جی ہی نے سرکار کو منایا۔

مکرم جاہ کی تعلیم پر شہزادی دُرشہوار نے خاص توجہ کی۔ اپنی خواہش اور سرکار کی ایما سے مکرم جاہ کو دہرہ دون بھیجا۔ بعد میں Harrow کیمبرج اور Sandurs ہی میں ہندوستان کے بڑے بڑے جنرل نے پڑھائی کی تھی۔ جب بھی پرنس لندن جاتے وہاں حیدرآباد ہاؤس میں قیام کرتے پرنسس درشہوار کا بھی وہیں قیام ہوتا ان کا انتقال بھی حیدرآباد ہاؤس ہی میں ہوا ہندن ہی میں والدہ کے بازو مزار ہے شادی میں پرنس مفخم جاہ شریک تھے پرنسس انوری بیگم کے بھائی اور بھاوج جو وہیں لندن میں تھے انہوں نے بھی شادی میں شرکت کی۔

پنڈت جواہر لعل نہرو پرنس مکرم جاہ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔اپنے پاس بلا کر عرصے تک رکھا یہ سوچ کر کہ انہیں کہیں ایمبسیڈر بنا کر بھیجیں گے مگر وہ نہ ہو سکا کیوں کہ مکرم جاہ یہ زندگی نہیں چاہتے تھے۔نہرو جی نے انہیں پروٹو کال ڈیپارٹمنٹ میں ٹریننگ کے لیے بھی بھیجا تھا اپنے ساتھ تری مورتی ہاؤس میں رکھا۔ ہندوستان کے کسی بھی پرنس کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔ پرنس آرمی جوائن کرنا چاہتے تھے آرمی ہیڈ کوارٹر کو اس مقصد کے لیے انہوں نے کئی خط لکھے مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اگر وہ آرمی میں جاتے تو بہت کامیاب جنرل ہوتے۔آج بھی ان کے مطالعہ میں جو کتابیں اور رسائل ہوتے ہیں وہ آرمی ہی سے متعلق زیادہ ہوتی ہیں۔ انہوں نے ہیڈ کوارٹر سے دریافت کیا کہ کیوں انہیں کمیشن نہیں مل رہا ہے کوئی تحریری جواب تو نہیں آیا مگر کسی اور ذریعہ سے معلوم ہوا کہ وہ نظام سابع کے پوتے ہیں اگر آرمی میں وار (War) میں آپ کو کچھ ہو گیا تو ہندوستان اسے برداشت نہیں کر سکے گا مگر عارضی طور پر پروٹو کال ڈیپارٹمنٹ ان کے ذمہ تھا۔سوچنے کی بات ہے مرکز میں جہاں شاندار حیدرآباد ہاؤس ہے جو انتہائی قیمتی فرنیچر سے سجا ہوا ہے وہاں وہ کیسے پروٹو کال آفیسر ہو سکتے تھے۔ آج بھی جتنے آفیشیل Delegates آتے ہیں ان کا خیر مقدم حیدرآباد ہاؤس میں ہی کیا جانا ہے۔مرکز میں دوسرے اسٹیٹ کے بھی ہاؤس ہیں مگر حیدرآباد ہاؤس کی بات ہی اور ہے جنوبی ہندوستان کا مرکز میں یہی ایک ہاؤس ہے۔نظام سابع کے وائسرائے سے بڑے اچھے تعلقات تھے ان کے پاس جانے کے لیے حیدرآباد ہاؤس بنا گیا ہے۔ ہندوستان کے تمام تین سو سے زیادہ اسٹیٹس میں ریاست حیدرآباد سب سے بڑی اسٹیٹ تھی۔ نظام نے War کے زمانے میں برٹش گورنمنٹ کی بڑی مدد کی تھی۔

پرنس مکرم جاہ جب شادی کر کے حیدرآباد آئے تو سب کو کہہ دیا تھا کہ پرنسس اسریٰ سے ہندوستان اور خصوصاً حیدرآباد

کے تعلق سے کچھ نہ کہیں ورنہ وہ شاید یہاں نہ آئیں وہ آئیں اور اپنے آپ کو نئی زندگی میں ڈھال لیا ان کے دونوں بچے اسی زمانے میں پیدا ہوئے۔ وہ ان کے بڑے پُرمسرت دن تھے۔ محبتوں میں ڈوبے ہوئے ایک دوسرے کی چاہت میں غرق تھے۔ پرنس اسریٰ پرنس کی مزاج شناس تھیں دونوں پارٹیز میں جاتے تعلیمی اداروں میں جا کر تعلیمی ترقی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ہمارے گھر کھانے پر کئی دفعہ تشریف لائے۔ اسی وقت ان کی ملاقات مہاراجہ پٹیالہ سے ہوئی دونوں نے مہاراجا کو پسند کیا آج بھی پرنس اسریٰ ماضی کے دنوں کے بارے میں پوچھتی رہتی ہیں مگر اس وقت جب ہم اکیلے ہوتے ہیں۔

پرنس مکرم جاہ اور پرنس اسریٰ اپنے چچا پرنس معظم جاہ کے پاس کھانے پر اکثر جایا کرتے تھے پرنس معظم جاہ کہتے ہیں بہت اچھے کوک تھے پکایا تو شاید کبھی نہ ہو مگر کھانے کا خاص Taste تھا۔ پرنس نیلوفر پرنس اسریٰ کو بہت پسند کرتی تھیں اپنی تمام تصاویر وہ پرنس ہی کے پاس چھوڑ کر گئیں۔

پرنس اسریٰ نے مکرم جاہ بہادر کا ہر طرح سے ساتھ دیا چومحلّہ اور فلک نما کی تزئین نو اور نئی صورت گری میں انہوں نے بڑی دلچسپی لی فلک نما اب دنیا کی سب سے بڑی ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔ وہاں مغلیہ اور حیدرآبادی کھانا آج بھی Serve ہوتا ہے۔

پرنس اسریٰ نے نہ صرف ہندوستانی لباس قبول کیا بلکہ اپنے شوہر کے بارے میں کبھی کوئی شکایت نہیں کی حالاں کہ شکایت کے لیے مواقع تھے۔ ان کے مطالعہ کا ذوق نہایت صاف ستھرا تھا۔

آج کل میں دیکھ رہی ہوں کہ عورتیں اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھ رہی ہیں وہ ایسے ملک میں پیدا ہوتی ہیں جہاں شرم و حیا عورت کا زیور دھرم ہے اب وہ لکھ رہی ہیں قلم ہاتھ میں آیا ہے تو بلولٹریچر نہ صرف لکھ رہی ہیں بلکہ اسے بڑھاوا بھی دے رہی ہیں اور اسے Feminism سمجھ رہی ہیں۔ Feminism آج مغرب میں زواں پذیر ہے عورت اپنی آزادی پر وہاں شرمندہ ہے اور ہم ہندوستانی عورتیں مغرب کی ننگی تہذیب کو اپنا کر فخر محسوس کر رہی ہیں۔ ہندوستان خواتین کو نازیبا آزادی پر اکسا رہی ہیں۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں عورت ستی ہونے پر فخر کرتی تھی وہ پابند بھی تھی آزادی بھی جبھی تو ہمارے یہاں خواتین نے جنگ میں بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تہذیب و تمدن میں حصہ لیا۔ تعمیرات اور ادب کو ترقی دی۔ میدان جنگ میں مردوں کی ہمت بندھاتیں تھیں جب شہسوار میدان جنگ میں مارے جاتے اور ملک پر دوسروں کا قبضہ ہوتا تو اس خیال سے کہ فاتح ان کو بے عزت نہ کر دیں، ''جوہر'' مناتیں تاکہ نہ کسی دشمن کے وہ ہاتھ لگیں نہ دشمن انہیں دیکھ سکیں۔ کتنی غیرت مند تھیں وہ اور آج ہماری تہذیب کتنی ننگی ہوتی جا رہی ہے۔

OOO

اہم فکشن نگار

نوارالحسنین

کا

نیا ناول

چاند ہم سے باتیں کرتا ہے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

طنز و مزاح

تماشائے اہلِ قلم

میر تقی میر کے ۷۲ نشتر مشہور ہیں۔ ۷۳ واں ہم نے دریافت کیا ہے جو ان کے دیوانِ اول میں ہے اور یہ ہے:

قیامت کو جرمانۂ شاعری پر
مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

میر صاحب کا معاملہ تو قیامت تک کے لیے ملتوی ہو گیا کہ وہ بڑے شاعر تھے لیکن ہمارے ننانوے فی صد ادیب اپنے حسنِ عمل کا نتیجہ اسی دنیا میں دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی کتابیں کوئی نہیں پڑھتا۔ جب کوئی پڑھتا نہیں تو کتابوں کے فروخت ہونے کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ بس شرمندگی کی دولت ہاتھ لگی ہے اور یہی دولت بیدار کتاب لکھنے والے کا خالص منافع ہوتی ہے۔

بیشتر ادیب اپنی کتابیں خود ہی چھاپتے ہیں خود اس لیے نہیں پڑھتے کہ ان کا پڑھنے کا معیار لکھنے کے معیار سے نسبتاً بہتر ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کتابیں ڈھیروں کی صورت میں پڑی رہتی ہیں اور دیمک کی شرح خواندگی میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں۔ جن نسخوں کو دیمک بھی چاٹنا گوارا نہیں کرتی وہ احباب میں مفت تقسیم ہو کر باہمی تعلقات کی خرابی کا سبب بنتے ہیں۔ مفت تقسیم ہونے والی کتابوں کا حشر اور بھی خراب ہوتا ہے کہ ان سے سڑے ہوئے پھلوں اور سبزیوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے کہ انھیں کوئی بھی اپنے پاس رکھنا گوارا نہیں کرتا۔ ممکن ہے بعض لوگ ہماری یہ بات سن کر کہیں کہ تشبیہ ناقص ہے، پھل اور سبزیاں سڑنے سے پہلے تر و تازہ بھی رہ چکی ہوتی ہیں، جب کہ بیشتر کتابیں اس مرحلے سے نہیں گزرتیں۔ معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم اس وقت شاعری نہیں کر رہے کہ کسی تشبیہ کے ناقص ہونے نہ ہونے کا خیال رکھیں، ہم کالم لکھ رہے ہیں، جیسا ناقص ہمارا کالم ہوتا ہے، اس کی مناسبت سے ناقص تشبیہیں ہی سوجھ سکتی ہیں۔

پچھلے دنوں ایک مشہور نقاد سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا ''میں نے پانچ برس تک ایک انگریزی اخبار میں اردو کتابوں پر تبصرے لکھے، اس سارے عرصے میں ایک بھی ڈھنگ کی کتاب پڑھنے کو نہ ملی، افسوس کہ میرے پانچ سال ضائع ہو گئے''۔ ہم نے عرض کیا ''آپ کو اپنے پانچ برسوں کے ضائع ہونے کا ملال ہے جب کہ ہمارے مصنفین اپنی پوری پوری زندگیاں ضائع کر دیتے ہیں پھر بھی خوش رہتے ہیں''۔ جناب نقاد نے فرمایا ''وہ اس لیے خوش رہتے ہیں کہ وہ کتابیں لکھتے ہیں اور میرے ملال کا سبب یہ ہے کہ میں انھیں پڑھتا ہوں''

ان نقادِ محترم کے مقابلے پر ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے اکٹھے پانچ برس کبھی ضائع نہیں ہوئے۔ ہر دوسرے تیسرے سال ایک آدھ ایسی کتاب پڑھنے کو ضرور مل جاتی ہے جو بے شمار ''نانوشتہ بہ'' کتابوں کے ذریعے پہنچنے والے صدمے کے اثرات کو زائل کر دیتی ہے۔ اس وقت ایک ایسی ہی کتاب ''تماشائے اہلِ قلم'' ہمارے سامنے ہے جس کے مصنف محمد لطف اللہ خان ہیں۔ خان صاحب اگرچہ پیشہ ور مصنف نہیں ہیں لیکن ادبی حلقوں میں ان کی شہرت پیشہ ور ادیبوں سے زیادہ ہے کیوں کہ انھوں نے ایک ایسا کام اپنے ذمے لے رکھا ہے جس کا ادب سے بہت گہرا تعلق ہے۔

خاں صاحب گزشتہ نصف صدی سے آوازیں جمع کر رہے ہیں۔ آوازیں جمع کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے جس کے پاس

بھی ایک ٹیپ ریکارڈر اور دس بیس ٹیپ ہوں، وہ آوازیں جمع کر سکتا ہے۔ لیکن خان صاحب نے جس بڑے پیمانے پر اور جیسی اعلیٰ مہارت سے یہ کام انجام دیا ہے، اس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں ہے اور شاید آیندہ بھی اس وادیٔ پُر خار میں ان جیسا کوئی آبلہ پا نہ آسکے کیوں کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے، اپنی تہذیب و ثقافت سے ہماری دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب ہم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو اجتماعی فائدے کا ہو۔ ہم ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ اس سے ہمیں ذاتی فائدہ کیا ہوگا۔

خاں صاحب کے کام کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جتنی آوازیں جمع کی ہیں، اگر انھیں بغیر کسی وقفے کے مسلسل ۲۴ گھنٹے سنا جائے تو اس کے لیے تقریباً سوا سال کی مدت درکار ہوگی۔ ان آوازوں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بڑے شعبے مذہب، ادب، موسیقی اور سیاست سے متعلق ہیں۔ آپ ان شعبوں سے متعلق کسی بھی ممتاز شخصیت کا تصور کیجیے اس کی آواز خان صاحب کے پاس موجود ہوگی۔ مثلاً ادب ہی کے شعبے کو لیجیے۔ اس میں کیا کچھ ہے، اس کا اندازہ ایک واقعے سے کیجیے۔ ایک مرتبہ خان صاحب کے صدا خانے میں کچھ ادیب جمع تھے، ایک صاحب نے ان کا امتحان لینے کے لیے کہا ''آپ کے پاس مشہور ترقی پسند نقاد احتشام حسین کی آواز تو ہوگی؟'' یہ سوال انھوں نے اس لیے کیا کہ احتشام حسین کبھی پاکستان نہیں آئے اور خان صاحب ہندوستان جا کر احتشام حسین کو ریکارڈ کرنے سے رہے۔ اس کے جواب میں خان صاحب نے بمشکل دس سیکنڈ صرف کیے اور ایک ٹیپ چلا دیا۔ احتشام حسین ایک مشاعرے میں ترنم سے غزل سنا رہے تھے۔ سوال کرنے والے صاحب حیران رہ گئے۔ انھیں خود معلوم نہیں تھا کہ احتشام حسین صرف نقاد نہیں تھے، شاعر بھی تھے اور کسی زمانے میں مشاعروں میں ترنم سے غزلیں پڑھا کرتے تھے۔

خان صاحب کے پاس فیض کا پورا کلام ان کی آواز میں موجود ہے جو فیض نے تقریباً ۲۵ برسوں میں قسط وار ریکارڈ کرایا تھا۔ فیض جب بھی کوئی نظم یا غزل لکھتے تھے، اسے خان صاحب کے ہاں ضرور ریکارڈ کرا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ خان صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کا سارا کلام میرے پاس آپ کی آواز میں محفوظ ہے۔ میری خواہش ہے کہ اب اک آدھ شعر ایسا بھی ریکارڈ کرا دیجیے جو کبھی شائع نہ ہوا ہو اور صرف میرے پاس محفوظ ہو۔ فیض نے اس خواہش کو یوں پورا کیا کہ فی البدیہہ دو شعر کہے اور ریکارڈ کرا دیے وہ شعر یہ ہیں:

ذکر پھر کیجیے اس گوشۂ تنہائی کا
جس میں ہر لحظہ بپا رہتی ہے اک محفلِ لطف
منزل نغمہ گراں، خانۂ شیریں سخناں
سربسر منبعِ سو لطف ہے یہ منزلِ لطف

یہ شعر فیض کی آواز میں صرف لطف اللہ خاں کے پاس ہیں، اور کاغذ پر بھی یہ دوسری مرتبہ منتقل ہوئے ہیں۔ پہلی مرتبہ ''تماشائے اہلِ قلم'' میں درج ہوئے تھے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس پر حیرت کریں کہ فیض نے ''منبع صد لطف'' کی جگہ ''منبع سو لطف'' نظم کیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، اسلوبِ زندگی کی طرح فیض کا اسلوبِ سخن بھی خاصا بے تکلفانہ تھا۔ وہ لفظوں کو نگینوں کی طرح جڑتے تھے۔ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ نگینہ انگوٹھی میں جڑا یا جا رہا ہے یا انگوٹھے میں۔

خان صاحب کے صدا خانے کے شعبہ ادب میں ادیبوں کی آوازوں میں ان کی تخلیقات بہت بڑی تعداد میں محفوظ کی گئی ہیں۔ مگر سب سے اہم چیز یہ ہے کہ درجنوں ادیبوں نے بہت سی ایسی باتیں ریکارڈ کرائی ہیں جو کسی دوسری جگہ موجود نہیں۔ ان

میں سرِ فہرست ادیبوں کے ذاتی حالات ہیں۔ بہت سے ادیبوں کے مستند حالات زندگی صرف خان صاحب کے صدا خانے میں ملیں گے۔ اسی طرح غیر مطبوعہ تخلیقات کا بہت بڑا ذخیرہ بھی اس صدا خانے میں محفوظ ہے۔ موجودہ عہد کے ادیبوں کے بارے میں آیندہ زمانے میں جب تحقیق ہوگی تو محقق صرف کتابوں سے استفادہ کر کے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے، انھیں خان صاحب کے صدا خانے میں بھی کچھ وقت گزارنا ہوگا کہ یہاں وہ سب کچھ موجود ہے جو کتابوں میں دستیاب نہیں۔

خان صاحب نصف صدی تک ادیبوں اور شاعروں سے ملتے رہے ہیں، اس کے باوجود ان کا اخلاق خراب ہوا ہے نہ زبان۔ حسنِ اخلاق کا تو یہ حال ہے کہ وہ تیسرے اور چوتھے درجے کے شاعروں کو بھی اپنے اسٹوڈیو میں بلا کر ان کا کلام ریکارڈ کر لیتے ہیں۔ اسی لیے ہم خان صاحب کو چھیڑا کرتے ہیں کہ جن شاعروں کو ادب کی تاریخ یاد نہیں رکھے گی، وہ بھی آپ کے صدا خانے کے کسی گوشے میں دستیاب ہو جائیں گے۔ یہ ادب دوستی نہیں کھلی ادب دشمنی ہے۔ اس کے جواب میں وہ بڑی معصومیت سے یہ کہتے ہیں ''میرا مزاج ہی ایسا ہے کہ میں ان چیزوں کی بھی قدر کرتا ہوں جن کی دوسرے ناقدری کرتے ہیں''

شاعروں ادیبوں سے اتنی میل ملاقات کے بعد بھی خان صاحب کی زبان کے خراب نہ ہونے کا ثبوت ان کی زیرِ نظر کتاب سے ملتا ہے۔ ایسی شگفتہ نثر ہماری نظر سے بہت کم گزری ہے۔ خان صاحب لکھتے نہیں تصویر کشی کرتے ہیں۔ ویسے تصویر کشی سے انھیں عملی دلچسپی بھی ہے۔ وہ فوٹو گرافر بھی ہیں اور مصور بھی۔ ان کے صدا خانے سے متصل ان کا نگار خانہ ہے۔ گویا انھوں نے جنت نگاہ اور فردوس گوش دونوں کا اہتمام کر رکھا ہے۔

''تماشائے اہلِ قلم' میں جوش، جگر، فیض، راشد، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیار پوری، استاد قمر جلالوی، عصمت چغتائی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور ذوالفقار علی بخاری کو زیبِ عنوان بنا کر مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان سب سے مصنف کے تعارف کی بنیاد ان کا صدا بندی کا شوق ہے۔ اسی شوق نے ذاتی مراسم کی راہ ہموار کی اور بعض ادیبوں سے خان صاحب کے زندگی بھر کے لیے گہرے اور مخلصانہ تعلقات قایم ہو گئے۔ خان صاحب نے اپنی کتاب میں انھیں تعلقات کی روداد بیان کی ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان مضامین میں صرف یہی کچھ ہو۔ مذکورہ ادیبوں سے تعلقات کی روداد کے علاوہ اور بہت کچھ بھی ہے اور یہی ''بہت کچھ'' اس کتاب کو مجموعۂ مضامین کی بجائے ایک آپ بیتی کی صورت عطا کر دیتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خان صاحب نے اپنے شوقِ صدا بندی کی داستان بیان کرتے ہوئے مذکورہ ادیبوں کے بارے میں اپنی یادداشتوں کو بھی سپردِ قلم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب کسی عنوان پر مضمون لکھتے ہیں تو اسی عنوان تک محدود نہیں رہتے، اس عنوان کے حوالے سے یاد آنے والی غیر متعلق باتوں کو بھی مضمون کے دامن میں سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔ خان صاحب کا انداز ایک ایسے قصہ گو کا سا ہے جو اصل قصے کے درمیان ضمنی قصے بھی سناتا جاتا ہے اور یہ ضمنی قصے اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ سننے والوں کا دھیان اصل قصے کی تکمیل کی طرف نہیں جاتا اور جاتا بھی ہے تو اس وقت جب خان صاحب اپنے قاری سے معذرت کرتے ہیں کہ وہ اصل موضوع سے ہٹ کر بات کر رہے ہیں یہ معذرت غیر ضروری ہے کہ کتاب کا حسن اصل موضوع سے ہٹ کر بات کرنے ہی سے نکھرتا ہے۔

ضمنی قصوں کی طرح کتاب میں درجنوں ضمنی شخصیات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ان شخصیات کے ذکر سے خان صاحب نے اپنی یادوں کے چراغ روشن کیے ہیں اور ایک ایسی محفلِ خوش نفساں

ترتیب دی ہے جس میں مشاہیر کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی شخصیات بھی نظر آتی ہیں جو ہماری ادبی وثقافتی زندگی میں کبھی بہت فعال تھیں مگر اب زمانے نے انھیں فراموش کر دیا ہے۔ ایسی ہی فراموش شدہ شخصیتوں میں مظفر حسین شمیم بھی ہیں۔ ایک زمانے میں ان کی شاعری اور مضمون نگاری کا بڑا چرچا تھا۔ اردو کے کئی ادبی رسالوں میں ان کا کلام اور مضامین چھپتے تھے۔ مگر آج ان کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں۔ شہرت کا یہ عبرت ناک انجام دیکھ کر ان ادیبوں سے ہم دردی پیدا ہوتی ہے جو صرف نام ونمود کی خاطر لکھتے ہیں اور لکھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

فنی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو زیرِ نظر کتاب میں صرف تین مضامین ایسے ہیں جنھیں شخصی خاکوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ مضامین حفیظ جالندھری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور ذوالفقار علی بخاری سے متعلق ہیں۔ ان تینوں کو خان صاحب نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کے بارے میں بعض ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ خصوصاً حفیظ جالندھری کی شخصیت کے تو بعض ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور ناقابلِ یقین بھی۔ مثلاً حفیظ نے خان صاحب کے صداخانے میں اپنے جو حالاتِ زندگی ریکارڈ کرائے ہیں، ان میں ایک یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ علامہ اقبال نے حفیظ سے کہا ''تمھارا کلام سن کر جتنا سکون حاصل ہوتا ہے، اتنا اپنا کلام سن کر حاصل نہیں ہوتا'' علامہ کی یہ خواہش بھی تھی کہ جیسی شاعری حفیظ نے کی ہے، ویسی ہی وہ بھی کر سکیں۔ اچھا ہی ہوا کہ علامہ کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی، ورنہ حفیظ تو ہمارے پاس دو ہو جاتے اور اقبال ایک بھی نہ ہوتا۔

ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ جس زمانے میں حفیظ محکمہ دفاع سے منسلک تھے ان دنوں اس محکمے کے سکریٹری اسکندر مرزا تھے۔ ایک مرتبہ حفیظ نے دفتری ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سکریٹری کی اجازت کے بغیر وزیرِ دفاع سے ملاقات کی۔ اسکندر مرزا کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے جواب طلبی کے لیے حفیظ کو بلایا اور اہتمام یہ کیا کہ اپنے کمرے سے سب کرسیاں اٹھوا دیں تاکہ حفیظ آئیں تو کھڑے ہو کر بات کریں۔ حفیظ نے جب کمرے میں کوئی کرسی نہ دیکھی تو اسکندر مرزا کے سامنے رکھی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ اسکندر مرزا غصے میں آ گئے اور رولر اٹھا کر حفیظ کو مارنا چاہا۔ آگے کا واقعہ بزبانِ حفیظ یہ ہے ''میں نے بڑھ کر پہلے تو پکڑا اس کا رولر اور آگے بڑھ کر ایک تھپڑ اس کے منھ پر دیا۔ میرے پاس پتھر پڑا ہوا تھا۔ پیپر ویٹ، میں نے اٹھا کر زور سے مارا جو اس کی چھاتی پر پڑا''۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ بڑے شاعر نہیں تھے، ناسخ کی طرح زور آزمائی بھی کرتے تھے۔

''تماشائے اہلِ قلم'' اسم بامسمّٰی کتاب ہے۔ محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' کی طرح کی ایسی ''تماشا گاہ'' ہے جس میں ادیبوں کے بے شمار کھیل تماشے دکھائے گئے ہیں۔

(۳/اکتوبر ۱۹۹۶ء)

ooo

سب رس

میں صرف غیر مطبوعہ مضامین اور

تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

افسانہ

محمد قمر سلیم

آتش فشاں

راعین پہلی ایسی آئی اے ایس آفیسر تھی جو اتنی کم عمر میں ملک کے چیف سکریٹری ہوم کے عہدے پر فائز تھی۔اس نے ۲۲ سال کی عمر میں آئی اے ایس کا امتحان ٹاپ کیا تھا۔راعین چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔اکلوتی ہونے کی وجہ سے سب کی چہیتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ سب پر اس کا خوب رعب چلتا تھا۔وہ بہت بولڈ آفیسر تھی۔اس کی شبیہ ایک ایمان دار بیوروکریٹ کی تھی۔کسی بھی غلط کام کو اس نے منظوری نہیں دی اسی لیے اس کے ہم منصبوں کے ساتھ ساتھ حکومت بھی بہت محتاط رہتی تھی۔راعین کی شخصیت ایسی تھی کہ ملک کا ہر سیاست داں اور حکومت کے وزراء اور اہم اعلیٰ عہدے داران سب ہی اس پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔اس نے اپنی ذہانت کی بنا پر نہ جانے کتنے مواقعوں پر ملک اور قوم کو خطروں سے باہر نکالا تھا۔ادھر کچھ مہینوں سے وہ بہت پریشان تھی کیوں کہ نئی حکومت جب سے آئی تھی اسے ہوم سکریٹری کے عہدے سے ہٹانا چاہتی تھی لیکن ڈرتی بھی تھی کہ اپوزیشن اور عوام حکومت کو چین سے نہیں رہنے دیں گے اس لیے چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

راعین جب سے ہوم سکریٹری بنی تھی اذلان اس کے ڈرائیور کے فرائض انجام دے رہا تھا۔حکومت نے اذلان کا بھی ٹرانسفر کرنا چاہا جسے راعین نے رکوا دیا اور یہ کہہ کر قصّہ ختم کیا جب تک وہ ہوم ڈپارٹمنٹ میں ہے،اذلان ہی اس کا ڈرائیور رہے گا۔اذلان راعین کا بہت خیال رکھتا تھا۔ایک دن راعین نے اس سے اس کے بارے میں پوچھنے کی کوشش بھی کی تو اس نے صرف اتنا بتایا کہ وہ سوپور کا رہنے والا ہے۔اب دلی میں شفٹ ہو گیا ہے اور ایشور نگر میں رہتا ہے۔اس کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن مائرہ بھی ہے جو کالج میں پڑھتی ہے اور وہیں ہاسٹل میں رہتی ہے۔ راعین اکثر اذلان کے بارے میں سوچا کرتی تھی کہ وہ اتنا اداس کیوں رہتا ہے؟اذلان کتنا ہینڈسم ہے،کتنی اچھی انگلش بولتا ہے،کتنا اچھا اس کا برتاؤ ہے ،پڑھا لکھا لگتا ہے پھر بھی وہ ڈرائیور کی نوکری کر رہا ہے؟نہ جانے کیوں، راعین کو اس کی آنکھوں سے درد جھلکتا سا نظر آتا تھا۔کچھ تو ہے جس کو وہ چھپا رہا ہے۔کچھ تو ہے جسے وہ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا ہے اس نے کئی بار پوچھنے کی کوشش کی لیکن اذلان زیادہ تر خاموش ہی رہا۔وہ جتنا اس کے بارے میں سوچتی اتنا ہی اذلان اس کے وجود پر طاری ہوتا جا رہا تھا۔وہ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو اذلان سے الگ نہیں کر پا رہی تھی۔دھیرے دھیرے راعین اذلان کی طرف کھنچنے لگی۔ایک انجانا سا خوف اس کو ستانے لگا کیوں کہ اس کے دل میں اذلان کے لیے ایک خاص مقام پیدا ہو گیا تھا۔وہ اذلان کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے۔اس کا جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی یکطرفہ دیوانگی کو کیا نام دے۔ کیا اس کے دل کے کسی گوشے میں محبت کا چراغ روشن ہے؟وہ اپنے ہی ڈپارٹمینٹ کے ادنیٰ سے ڈرائیور سے محبت کیسے کر سکتی ہے۔دنیا،حکومت اور ملک کے عوام اس کے بارے میں کیا سوچیں گے؟مگر اس نے کبھی بھی اپنے فرائض سے کوتاہی تو نہیں کی ہے۔اس نے کبھی بھی حکومت کو اور عوام کو مایوس نہیں کیا ہے۔کیا اس کا یہ قدم سب کے لیے باعث شرم ہوگا۔۔۔مگر یہ تو اس کا ذاتی معاملہ ہے۔تو کیا ہوا دنیا بھر کی نظریں تو اس کے اوپر ٹکی ہوئی ہیں۔دنیا اسے اس کے

ذاتی معاملے کے طور پر تو نہیں دیکھے گی۔ وہ عجب کشمکش میں تھی۔ وہ اپنے آپ بڑبڑانے لگی 'مگر میں بھی تو انسان ہوں، کیا میرے جذبات نہیں ہیں؟ کیا میرے سینے میں دل نہیں دھڑکتا؟ اور نہ جانے ایسے ہی کتنے سوالات اس کے ذہن میں ابھرتے رہے۔ اس نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے دی، راعین! ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ بھی ایک عورت ہے جس کے سینے میں ایک حسّاس دل دھڑکتا ہے اور ہر عورت کی طرح اسے بھی اپنے جذبات کی عکاسی کرنے کا حق ہے۔ یہی سوچ کر اس نے سوچا اسے اذلان سے اپنی خواہش کا اظہار کر دینا چاہیے۔ لیکن کیسے؟ ایک دن جب وہ گھر واپس جا رہی تھی، اچانک اس نے اذلان سے کہا، 'اذلان ذرا کار روکیے۔' اذلان نے ایک جھٹکے کے ساتھ کار روک دی۔ کار رکتے ہی راعین آگے کی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اذلان کے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ راعین کے بیٹھنے کے بعد اذلان نے کار کو پھر سڑک پر دوڑانا شروع کر دیا۔ راعین نے اس سے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ اذلان سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اس کا گھر آ گیا تھا۔ وہ اذلان کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی کار سے اتر گئی اور کار اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

تین دن ہو چکے تھے اسے آگے کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے لیکن وہ اپنے دل کی بات اذلان سے نہیں کہہ سکی تھی۔ آج وہ کچھ سوچ کر پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنے جا ہی رہی تھی کہ اذلان نے اس سے کہا، 'میڈم! کیا بات ہے آج آگے نہیں بیٹھیں گی۔' اسے جیسے کرنٹ لگا ہو اور وہ کچھ کہے بنا آگے جا کر بیٹھ گئی لیکن پھر وہی خاموشی۔ اس نے ایک بار پھر اذلان کی ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ 'ارے اذلان آپ اپنی بہن کو ہمارے گھر لے کر آئیے' 'جی میڈم!' اس کا مختصر سا جواب تھا۔ 'اذلان آپ کی بہن کیا کر رہی ہے؟' 'جی! وہ ڈینٹسٹ کا کورس کر رہی ہے۔' 'ارے واہ! بہت اچھا کیا جو اس کو آپ لوگ ڈینٹسٹ بنا رہے ہیں۔ یہ کتنی خوش آئند بات ہے کہ آج ہم مسلم لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔' کچھ دیر بعد اس نے اذلان کو مخاطب ہو کر پوچھا، 'اذلان! آپ اگر برا نہیں مانے تو پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے اعلیٰ تعلیم کیوں حاصل نہیں کی۔' اذلان نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی شکر تھا کہ آگے پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی حالانکہ اذلان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اذلان بولا، 'نہیں میڈم! ایسا نہیں ہے۔' اور پھر اتنا کہہ کر اذلان تو جیسے پھٹ پڑا تھا۔ 'میڈم! آپ اونچے عہدے پر بیٹھے لوگ کیا جانیں گے کشمیریوں کے بارے میں۔' اس نے بہت طنزیہ لہجے میں کہا، 'کشمیری تو صرف دہشت گرد بن سکتا ہے، اسے کیا لینا دینا پڑھائی سے۔ آپ اعلیٰ تعلیم کی بات کر رہی ہیں،۔ کچھ وقفے کے بعد اذلان رندھی ہوئی آواز میں بولا، 'کشمیر کا ہر بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ہر کشمیری طالب علم کچھ بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ ہر کشمیری نوجوان ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے۔ میں جو بننا چاہتا تھا وہ نہیں بن سکا، کیا ملا مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے۔'

اس کی عجیب کیفیت تھی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا، 'میڈم! میں کشمیری ہوں اور ایک کشمیری کا درد صرف ایک عام کشمیری سمجھ سکتا ہے، یہ اعلیٰ عہدوں پر فائز کشمیری بھی نہیں اور مرکز کی بات کرنا تو فضول ہے۔ کون سے ماں باپ ہیں جو چاہیں گے کہ ان کا بچہ بڑا ہو کر بندوق ہاتھ میں اٹھائے؟ کون سی ماں چاہے گی کہ اس کی کوکھ سونی ہو؟ کس باپ نے خواب نہیں دیکھے؟ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہمارے دل ہندوستان کے لیے دھڑکتے ہیں۔ 'سارے جہاں سا اچھا ہندوستاں ہمارا' ہم کہتے

نہیں تھکتے۔اور ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم آزاد کشمیر بنا نہیں سکتے، پاکستان کے ساتھ جا نہیں سکتے، اور ہندوستان ہمیں اپنانا نہیں چاہتا۔ہم کریں تو کیا کریں؟ ہمارے بچے پڑھنا چاہتے ہیں لیکن ان کے ہاتھوں میں کتابوں کی جگہ پتھر پکڑا دئے گئے سیاہی کی جگہ خون سے ان کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ان کے خواب ریت کے ٹیلوں کی طرح ہیں کہ کب طوفان آئے اور ان کے خوابوں کو چکنا چور کر کے چلا جائے۔اب تو ہر کوکھ سوکھ گئی ہے اور پھر کوئی کیوں اپنی کوکھ ہری کرے، کیا اس لیے کہ اس میں دہشت گرد بسیرا کرے۔ بچے کا وہ حسین احساس ہر کشمیری عورت کے لیے خواب بن کر رہ گیا ہے کیوں کہ وہ حقیقت بننے سے پہلے ہی چکنا چور ہو جاتا ہے۔کشمیر کا کوئی گھر ایسا نہیں ہے جہاں ماتم نہ ہوتا ہو، جہاں کوکھ سونی نہ ہوئی ہو۔وہاں ہر ماں روتی ہے، ہر باپ تڑپتا ہے، ہر بیٹی سسکتی ہے اور ہر بیٹے کا خون کھولتا ہے۔ ہر کشمیری امن چاہتا ہے ،کشمیر کی ترقّی چاہتا ہے لیکن یہ سیاست داں پاکستان کا بہانہ لیکر کشمیریوں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔یہ کشمیریوں کے کاروبار تباہ کر رہے ہیں۔کشمیری سیاحت ختم کی جا رہی ہے۔کشمیری بے روزگار ہو رہے ہیں۔کیا پھر بھی کشمیری تشدد اپنائے گا۔ارے اس کے تو دو وقت کے کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔صبح کھاتا ہے تو شام کی فکر ستانے لگتی ہے۔وہ تشدد کیوں کر کرے گا؟ کیا ہر ماں بچے کو اسی لیے جنم دے رہی ہے کہ اسے تشدد کی نظر کر دے۔ نہیں یہ صرف سیاست کا کھیل ہے جس میں عام کشمیری مارا جا رہا ہے۔سیاست داں نہیں چاہتے کہ کشمیر کا کوئی حل نکلے کیوں کہ جس دن کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے گا اس دن ان سیاست دانوں کی دوکانیں بند ہو جائیں گی۔ان سیاست داں کو کوئی فرق نہیں پڑتا ان کو تو صرف اقتدار چاہیے ہے، سیاست کرنا ہے چاہے وہ انسانی لاشوں پر ہی کیوں نہ ہو۔ان کے بچے نہیں مرتے ہیں۔ان کے یہاں کوکھ سونی نہیں ہوتی، ان کے گھر نہیں اجڑتے ہیں، ان کے خواب چکنا چور نہیں ہوتے ہیں، ان کے یہاں ماتم نہیں ہوتا ہے، ان کے بچوں کو پتھر نہیں ملتے، کتابیں ملتی ہیں کتابیں۔۔۔یہ کیا جانے درد کیا ہوتا ہے؟ یہ کیا جانے موت کیا ہوتی ہے؟ یہ دلوں کی تڑپ کیا جانے؟ یہ تو سب بیوپاری ہیں بیوپاری۔۔۔لاشوں کے بیوپاری ، جذبات کے بیوپاری، دلوں کے بیوپاری۔۔۔یہ کیا جانے دہشت کیا ہوتی ہے؟ گولی کی آواز اور دردناک چیخ کی آواز میں کیا فرق ہوتا ہے؟ پیلٹ گن سے ان کے بچے اندھے نہیں ہوتے ، ان کی اور ان کے اہلِ خانہ کی زندگیاں برباد نہیں ہوتیں۔آپ کو کیا معلوم ہر ماں راستے میں نگاہیں بچھائے بیٹھی رہتی ہے، وہ جب تک دروازے سے نہیں ہٹتی جب تک اس کا لال گھر نہ آجائے اور پھر وہ شکرانۂ رب بجا لاتی ہے۔اسے تو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا لال خود واپس آئے گا، یا چار کاندھوں پر سوار ہو کر آئے گا یا پھر اس کے لاپتا ہونے کی خبر آئے گی اور پھر اس کا انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھیں پتھرا جائیں گی۔یا پھر اس کے بیٹے کی لاش آئے گی اور پھر اس کے احتجاج میں اور لاشیں بچھ جائیں گی اور پھر نہ جانے کتنی گودیں سونی ہو جائیں گی۔کوئی نہیں سمجھ سکتا کشمیری کا درد کوئی نہیں۔۔۔کوئی ہمارے بارے میں کچھ نہیں سوچتا۔نہ ہماری ریاست کے لوگ اور نہ ہمارے ملک کے لوگ۔ہمیں تو سب نے زخم دیے ہیں۔کیا ہمارے ہندوستانی آقا اور کیا ہمارے نام نہاد پاکستانی آقا۔اور کیا دیا ہے ہندوستانی مسلمانوں نے ہمیں؟ ہم اپنی جنگ خود ہی لڑ رہیں ہیں۔۲۰۔۲۵ کروڑ کی آبادی نے کب ہمارے لیے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ہم سے صرف اتنی محبت ہے کہ کبھی کبھار کسی اخبار میں ہم سے ہمدردی کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔یہی ہمارا وجود ہے، یہی ہماری داستان ہے۔'

'ہاں میڈم! آپ نے پوچھا تھا کہ میں کیوں اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکا؟ میری بھی دنیا تھی میرے بھی حسین خواب تھے ایک جھٹکے میں سب چکنا چور ہو گئے۔ میرے والد کشمیر کے بڑے بزنس مین تھے۔ میں بھی آئی اے ایس آفیسر بننا چاہتا تھا۔ میرے والدین نے ہم سب بہن بھائیوں کو اچھے اسکول میں پڑھایا تھا۔ یہ اب سے آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ میں انٹر پاس کر کے بی ایس سی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا ساتھ ہی آئی اے ایس کی تیاری بھی چل رہی تھی۔ میرے چھوٹے بھائی روحان نے دسویں پاس کی تھی اور میری بہن زائرہ انٹر میں تھی وہ میڈیکل میں جانا چاہتی تھی۔ مائرہ جو میرے ساتھ رہتی ہے نویں میں تھی۔ تبھی دہشت گرد میری بہن زائرہ کو اٹھا کر لے گئے۔ زائرہ اور روحان بہت چیخے چلّائے لیکن گولیوں کی آوازوں کے بیچ ان کی چیخ پکار بے معنی تھی۔ روحان کسی طرح ان کے ٹرک میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ ان کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ ہم نے سارے جتن کر لیے۔ پولس، منسٹر، نیتا کسی کو نہیں چھوڑا۔ اپنے بچوں کو واپس لانے کے لیے میرے باپ نے سب کے آگے ہاتھ جوڑے۔ وہ دن ہمارے گھر قیامتِ صغرا لیکر آیا تھا۔ گھر ماتم کدہ بن گیا۔ چولھے بجھ گئے تھے، سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ زندگی ہم سے روٹھ گئی تھی۔۔۔ ماں باپ کے آنسوؤں کے بیچ لوگوں کی جھوٹی ہمدردیاں، فریبی وعدے۔ روتے روتے ماں کی آنکھوں کا پانی سوکھ گیا تھا۔ بابا کا سینا دھونکنی بنا ہوا تھا۔ مائرہ حیرانی کی مجسم تصویر تھی۔ میں پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر بس چکر کاٹ رہا تھا۔ ہمارے ہنستے کھیلتے گھر کو نظر لگ گئی تھی۔ میرے بابا کا بڑے بڑے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ انھوں نے زمین آسمان ایک کر دیا مگر ان کے بچوں کا کچھ پتا نہیں چلا۔

تقریباً ۱۵ دن بعد ایک شام جے کے ایس اے کی گاڑی ہمارے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ انھوں روحان کی لاش کو باہر نکالا اور زائرہ، جو ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی، کو گاڑی سے اتارا۔ جے کے ایس اے کے جوانوں اور آفیسرز نے مجھے اور میرے بابا کو دلاسا دیا اور کہا، 'ہماری اسپیشل ٹیم نے آپ کی بیٹی اور بیٹے کو بچانے کی پوری کوشش کی لیکن ہم آپ کے بیٹے کو نہیں بچا سکے۔ زائرہ نے آفیسرز اور جوانوں کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ ایک جمِ غفیر امنڈ پڑا تھا ہمارے گھر پر۔ ہزاروں لوگوں نے روحان کی تدفین میں حصّہ لیا تھا۔ گھر میں قبرستان جیسی خاموشی تھی۔ زائرہ نے بسترِ مرگ پکڑ لیا تھا۔ امی بابا غم سے نڈھال تھے، میں بھی ٹوٹ چکا تھا؛ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ غصے سے پاگل ہوئے جا رہا تھا۔ راعین کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ پر چلا گیا تھا اذلان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کے چند قطرے اس کے ہاتھ پر گرے۔ راعین نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اذلان کو تسلی دی۔ اذلان آگے کچھ کہنے والا تھا کہ راعین کا گھر آ گیا۔ اس نے سوچا کار کا رخ مڑوا دے لیکن کار اس کے دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کار سے اتر کر لاچار و مجبوری کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

وہ رات بھر سو نہیں سکی تھی نہ ہی اس نے رات میں کھانا ٹھیک طرح سے کھایا تھا وہ تو فقط اذلان کے خیالوں میں ہی گم تھی، اس کے بارے میں ہی سوچے جا رہی تھی۔ اس نے سچ ہی تو کہا تھا کہ کشمیریوں کے لیے کوئی کچھ نہیں کر رہا ہے۔ صرف ان کو بہکے ہوئے نوجوان کہہ کر سب اپنا پلّہ جھاڑ لیتے ہیں۔ کتنی سچائی تھی اذلان کی باتوں میں، کتنا درد چھپا تھا اس کے سینے میں۔ اتنے اونچے عہدے پر فائز ہونے کے بعد بھی وہ بھی تو کشمیریوں کے لیے کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی لیکن یقیناً وہ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں سوئی تھی۔ صبح نو

بجے اذلان کار لیکر آ گیا تھا۔ پی ایم او سے ایک اہم کال آئی تھی اس لیے اس نے اذلان سے پی ایم او آفس چلنے کے لیے کہا تھا۔ وہ دونوں راستے بھر خاموش رہے۔ پی ایم او آفس میں اس نے پرائم منسٹر کے سکریٹری سے کچھ ضروری باتیں کی۔ دس منٹ بعد وہ وہاں سے نکلی لیکن کچھ پریشان سی تھی پی ایم او سے وہ سیدھی اپنے آفس آئی اور اب وہ اتر پردیش کے تین دن کے دورے پر جا رہی تھی۔ دوپہر میں اس کی ماں کا فون آیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو' آپا ' کہہ کر بلاتی تھی۔ 'جی آپا! بولیے۔' ہاں بیٹا، ارے بیٹا میں نے تجھے بتایا تھا نا رشتے کے بارے میں۔ وہ تیرے پاپا پوچھ رہے تھے۔' اس نے ماں سے بہت ہی جھنجھلا کر کہا تھا' ارے آپا! ایسی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو میں لکھنو جا رہی ہوں وہاں سے آ کر بات کرتی ہوں۔' 'اچھا' کہہ کر اس کی ماں نے فون رکھ دیا۔ راعین کافی پریشان تھی کیوں کہ یوپی میں فرقہ وارانہ فسادات ہو گئے تھے جس میں کافی جانی مالی نقصان ہوا تھا۔ حکومت کسی بھی قیمت پر نہیں چاہتی تھی کہ صحیح بات میڈیا کے سامنے آئے اسی لیے راعین کو لکھنؤ میں پڑاؤ ڈالنا ہی تھا۔ حکومت کو یقین تھا کہ وہ معاملے کو سنبھال لے گی۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ وہ حالات کو معمول پر لانے کے بعد دلی واپس آ گئی تھی۔ صبح جب وہ گھر سے نکل رہی تھی اس کی ماں نے وہی راگ الاپا اس کی شادی کا۔

وہ شام کو گھر آنے کے بعد وہ اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھومنے لگی۔ ماں نے اس سے کہا، 'پہلے مجھے بتا تیرا کیا ارادہ ہے مجھے تیرے پاپا کو جواب دینا ہے۔' 'ہاں، آپا! مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔' پھر اس نے اپنی خواہش کا اظہار اپنی ماں سے کر دیا۔ 'بیٹا! اپنے پاپا اور بھائیوں کے سامنے یہ بات اپنی زبان پر بھی مت لانا، تیرے پاپا اور بھائی کبھی راضی نہیں ہوں گے، نہیں بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا' اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔ 'آپا! کیوں نہیں ہو سکتا۔ آپا میں کہیں اور شادی نہیں کروں گی۔ کوئی کچھ سوچے کوئی کچھ سمجھے میں صرف اذلان سے ہی شادی کروں گی۔' 'بیٹا یہ کیسی ضد ہے۔' 'نہیں! آپا، یہ ضد نہیں ہے۔ میں اذلان کے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہوں۔' 'لیکن بیٹا! دنیا جہان کیا کہے گا۔ تیرے پاپا بھائی کسی کو منھ دکھانے لایق نہیں رہیں گے اور پھر لوگ تیرے بارے میں کیسی کیسی باتیں کریں گے۔ تیری ساکھ پے کتنا اثر پڑے گا۔'

دھیرے دھیرے راعین نے اذلان کے دل میں جگہ بنالی اور اب اذلان بھی راعین کی طرف راغب ہو رہا تھا۔ راعین کے ارادے اب اور بھی مظبوط ہو گئے تھے۔ اس نے اذلان کو شادی کے لیے بھی تیار کر لیا تھا۔ اس نے اپنے پاپا اور بھائیوں کو بھی بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن سب بے سود لیکن راعین اپنے ارادے سے ٹس سے مس نہیں ہوئی اور ایک دن اذلان اور راعین نے کورٹ میرج کر لی۔ ان کی شادی ہوتے ہی اس کے والدین اور بھائیوں نے اس کا سرکاری بنگلہ چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنے آبائی مکان میں واپس چلے گئے تھے۔ ادھر حکومت نے اذلان کا ٹرانسفر ہوم سے سوشل ویلفیر ڈپارٹمنٹ میں کر دیا تھا۔

اس شادی کی وجہ سے اس کی زندگی میں بحران پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ آفس کی زندگی میں بھی ہلچل مچ گئی تھی۔ نئی حکومت پہلے ہی سے اس کے اوپر اعتبار نہیں کر رہی تھی یہ سنہرا موقع اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اب حکومت کے احکامات اس تک نہیں آتے تھے۔ ایک طرح سے سارا کام کاج اس کا ڈپٹی سنبھال رہا تھا۔ ہے۔ حکمران پارٹی کی طرف سے اس پر تنقیدیں بھی بہت ہو رہی تھیں۔ گھر والے بھی اس سے خفا تھے۔ اس گھڑی میں اگر کوئی اس کے ساتھ تھا تو اذلان اور اس کی ماں۔ تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ اس کی ماں کا فون تھا۔ 'جی آپا!' بیٹا تو فکر نہ

کر سب اچھا ہو جائے گا۔ میں تیرے پاپا اور بھائیوں کو منا لوں گی ۔ بیٹا ویسے تجھے سب مس کرتے ہیں ۔ بیٹا تو اپنا خیال رکھنا۔ تیری بہت یاد آ رہی ہے۔' وہ خاموشی سے سنتی رہی ، اس کی ماں رو رہی تھی ۔ پھر وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگی ۔ کتنے دکھ اٹھائے ہیں میری ماں نے ۔ میری خاطر اسنے اپنی پوری جوانی داؤ پر لگا دی۔ اس کی سب خواہشات، تمنائیں، خاک میں مل گئیں، اس کا ہر خواب چکنا چور ہو گیا۔ جوانی میں اس پر بڑھاپا آ گیا۔ کیا نہیں کیا اس نے میرے لیے۔ میں تو بچپن سے ہی بیمار رہتی تھی اور بیماری بھی ایسی جو زندگی بھر کا روگ تھی، روزانہ ہی تو کم سے کم ہر تین گھنٹے بعد میری تھر پی ہوتی تھی۔ ڈاکٹرس بھی تو پر امید نہیں تھے۔ وہ تو میری ماں کی انتھک محنت تھی جس کی وجہ سے آج میں یہاں ہوں۔ مجھے نہیں یاد ہے کہ میری ماں کبھی بھی تین گھنٹے سے زیادہ سوئی ہو۔ اس نے میری نوکری لگنے کے بعد ہی تو سروس چھوڑی تھی۔ صبح سے لیکر رات تک سب کے کام کرنا۔ پورے ۲۴ گھنٹوں میں کم سے کم چھ مرتبہ میری تھیر پی کرنا۔ اور رات میں سب کے سونے کے بعد میری تھر پی کر کے پھر سونا۔ اور وہ بھی جب کہ مجھے جنم دینے والی ماں تو مجھے دو سال کا ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی ۔ مجھے زندگی کے اصل معنی تو میری آپا نے بتائے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کیوں لوگ ماں کو سوتیلا اور حقیقی کے نام دیتے ہیں، کیوں ماں کے ساتھ سابقے اور لاحقے لگائے جاتے ہیں۔ ماں تو ماں ہوتی، صرف ماں۔ اس کے منھ سے ایکدم نکلا، 'اے اللہ ! تو سب کو میری ماں جیسی ماں دینا۔'

وہ اپنے پاپا کو بہت چاہتی تھی ۔ اس کے پاپا یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ وہ روشن خیال، سلجھے ہوئے ذہن کے مالک تھے۔ ہر چھوٹے بڑے سے بہت محبت کرتے تھے۔ امیر غریب میں کبھی فرق نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سب برابر تھے۔ وہ تو کہتے ہیں چھوٹے لوگ بہت حساس ہوتے ہیں ان کی دلشکنی نہیں کرنا چاہیے اسی لیے اسے سب سے زیادہ دکھ اپنے پاپا کے رویّے سے ہوا تھا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ جب وہ اذلان سے شادی کی بات کہے گی تو اس کے پاپا اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ازلان گہری نیند سو رہا تھا۔ راعین خود سے باتیں کرنے لگی، 'پاپا اذلان بہت اچھے ہیں، وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ بہت پڑھے لکھے ہیں۔ پاپا میں جانتی ہوں آپ کی انا کو ٹھیس پہنچی ہے لیکن پاپا ایسا نہیں ہے۔ اذلان ہر لحاظ سے ہمارے خاندان سے کسی بھی طرح کم نہیں ہیں۔ سروس کرنے سے کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہو جاتا ہے۔ اذلان نے ایم ایس سی انجینیر نگ اور ایم بی اے کیا ہے۔ پاپا آپ شاید نہیں جانتے کہ اتنا پڑھ لکھنے کے بعد اذلان کا ہوم منسٹری میں ڈرائیور کی پوسٹ پر کام کرنا مصلحت سے خالی نہیں تھا۔ اذلان انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ بارود کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سینے میں آتش فشاں سلگ رہا تھا۔ پاپا آپ کو تو اپنی بیٹی پر فخر کرنا چاہیے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی نے ایک آتش فشاں کو ٹھنڈا کر دیا۔ اگر یہ آتش فشاں پھٹ جاتا تو قیامت برپا ہو جاتی۔ پھر صرف کشمیر ہی نہیں جلتا پورا ملک اس کی لپٹوں میں جھلس جاتا۔ اور اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہی ہوتا۔۔۔ پاپا! مجھے وہ دن یاد ہے جب اذلان نے مجھے بتایا تھا۔۔۔ اذلان نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بہت جذباتی ہو کر کہا تھا، 'روحان کے انتقال کے چند دنوں بعد ہی زائرہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ روحان اور زائرہ کی موت کے بعد امی بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ صرف آسمان کی طرف دیکھتی رہتی تھیں۔ پھر ان کے بھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا اور ایک دن وہ بھی خاموشی سے ہم سب سے بہت دور چلی گئیں۔ میرے بابا اتنا زیادہ ڈر گئے تھے کہ مائرہ کو اپنی نظروں سے ایک

پل کے لیے بھی اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ میں نے کسی مرد کی آنکھوں میں اتنا خوف نہیں دیکھا تھا۔ بابا تین مہینے تک صدمہ برداشت کرتے رہے پھر انھوں نے بھی زندگی سے ہار مان لی۔ میں بھی بے بس تھا۔ دل تو چاہتا تھا سب کچھ جلا کر راکھ کر دوں لیکن بابا نے مائرہ کی ذمے داری میرے اوپر ڈال دی تھی۔ میں صرف ایک خاموش تماشائی بن کر رہ گیا ہوں اور مائرہ تو بے جان پتھر ہے۔ اس نے ہنسنا رونا سب چھوڑ دیا ہے۔ اسے دیکھ کر بہت ڈر لگتا ہے کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھالے اسی لیے میں اپنے غصے کو پی گیا۔ بابا نے ہی مرنے سے پہلے مجھ سے کہا تھا بیٹا مائرہ کو یہاں سے دلی لیکر چلے جاؤ۔ یہاں یہ تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے اور مائرہ کا بھی وہ وہی حشر کریں گے جو انھوں نے زائرہ کا کیا تھا۔ بیٹا مائرہ یہاں محفوظ نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی وہ کرو جو روحان نے کیا۔ میں نہیں چاہتا میرے خاندان کا نام ونشان مٹ جائے۔ اور پھر مرتے وقت انھوں نے کہا تھا بیٹا روحان کو دہشت گردوں نے نہیں جے کے ایس اے نے مارا تھا اور انھوں نے ہی زائرہ کے ساتھ اتنے دن منھ کالا کیا۔ بیٹا زائرہ نے اس وقت اشارے سے ان آفیسرز کے بارے میں بتانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ہم نہیں سمجھ سکے۔ مرتے وقت اس نے سب کچھ بتایا تھا وہی آفیسرز جو انھیں چھوڑنے آئے تھے انھوں نے ہی ان کے ساتھ ننگا ناچ کھیلا تھا اور الزام دہشت گردوں پر عائد کر دیا تھا' یہ کہہ کر اذلان خاموش ہو گیا تھا۔ پاپا آپ کو یہی شکایت ہے نا کہ میں نے آپ کی مرضی سے شادی نہیں کی۔ پاپا سچ تو یہ ہے کہ جو رشتے

آرہے تھے انھیں مجھ میں دلچسپی نہیں تھی بلکہ میرے عہدے سے دلچسپی تھی۔ مجھے اذلان سے اچھا شوہر مل ہی نہیں سکتا تھا، وہ سچی محبت کرنے والا انسان ہے۔ پاپا! اور پھر آپ کی اپاہج بیٹی کو کون حقیقت میں اپنا تا۔۔۔کوئی نہیں! صرف اور صرف اذلان ۔'

راعین گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنی آپا کو فون ملایا۔ 'ہاں بیٹا۔ اچھا ہوا تیرا فون آ گیا۔ میں تجھے ہی فون کرنے والی تھی ۔کل ہم سب لوگ تیرے گھر آرہے ہیں۔ ہاں ہاں تیرے پاپا اور سب بھائی۔ میں نے کہا تھا نہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔' اس کی آپا نے سب ایک سانس میں کہہ ڈالا۔ راعین نے اذلان کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔

ooo

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200روپے

-/800طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

شاعری

غزلیں

کرشن کمار طور

کچھ زیادہ ہیں کچھ کمی کے دن
کب بھلا ہیں برابری کے دن

اک سے کٹتے نہیں فراق و وصال
اک سے ہوتے نہیں سبھی کے دن

غم کی راتیں کبھی گذرتی نہیں
کبھی رہتے نہیں خوشی کے دن

کب پرندے اڑان بھرتے ہیں
دسترس میں کہاں کسی کے دن

بے اثر ہو گئیں دعائیں سب
موت جیسے ہیں زندگی کے دن

کیا کہوں یہ ہوا ہوئے کب کے
جس قدر تھے ہنسی خوشی کے دن

یاد بھی ان کی اب محال ہے طورؔ
کٹ چکے اب سخن وری کے دن

نہ ہے زمیں پہ نہ اب آسماں پر میرا کچھ
دکھائی دیتا ہے سب کو کہاں پہ میرا کچھ

وہ مجھ کو رکھتا ہے اپنی سپرد داری میں
چنانچہ ہے بھی نہیں بھی یہاں پہ میرا کچھ

میں بہتا جاتا ہوں بس ایک تنکے کی مانند
کہ زور اب نہیں موج رواں پہ میرا کچھ

کسے میں اپنا کہوں کس کو ملکیت سمجھوں
یہ دہر وہ ہے نہیں ہے جہاں پہ میرا کچھ

بہار ہی سے جنوں استوار کرتا ہوں
کہ بس تو چلتا نہیں ہے خزاں پہ میرا کچھ

سجائیں راہ بلا خیز اب مرے سر سے
ہے حق تو بنتا صف دشمناں پہ میرا کچھ

خموشی لفظوں کا اوڑھے ہوئے ہے جامہ طورؔ
کہاں کمال ہے میرے بیاں پہ میرا یہ کچھ

شاعری

غزلیں

اظہار وارثی

قدموں کو جستجو نے ٹھہرنے نہیں دیا
جس کی طلب تھی دل کو، نظر نے نہیں دیا

لاکھوں جتن کیے غمِ حالات نے مگر
اک حوصلہ تھا جس نے بکھرنے نہیں دیا

کرتی رہی فرار کی تدبیر زندگی
اور مجھ کو میری موت نے مرنے نہیں دیا

جانے گا اور میری شبِ غم کا حال کون
راتوں کا کچھ حساب سحر نے نہیں دیا

سائے میں جس کے آیا تھا کوئی مرے قریب
اس پل کو زندگی نے گزرنے نہیں دیا

کیسی تڑپ، کہاں کا گلہ، کیسا احتجاج
ضبط ستم نے آہ بھی کرنے نہیں دیا

صورت گری پہ جس کی ترش جاتے میرے ہاتھ
اتنا کمال مجھ کو ہنر نے نہیں دیا

دن بھر فضا کو رکھا سیاہ آندھیوں نے قید
سورج کو میرے گھر میں اُترنے نہیں دیا

ہمدرد ہیں مگر، وہ مزاج آشنا نہیں
چارہ گروں کے پاس ہماری دوا نہیں

دل کے معاملات بھی کتنے عجیب ہیں
ہم اس کے ہو گئے جو ہمارا ہوا نہیں

چپ لگ گئی ہے گو پئے اخفائے راز دل
خوشبوئے درد عشق مگر نارسا نہیں

ڈوبا ہوا ہوں وسعت صحرا کی پیاس میں
شبنم کی بوند بوند سے میرا بھلا نہیں

پائیں گے اب کہاں مجھے یاران ناشناس
میں خود سے ہوں فرار مرا کچھ پتہ نہیں

کس آسرے پہ کھول دوں کشتی کے بادبان
جانا جدھر ہے مجھ کو ادھر کی ہوا نہیں

دل میں دیا ہوا ہے مگر دوریوں کا درد
ویسے تو اپنے بیچ کوئی فاصلہ نہیں

شاعری

غزل و نظم

محمد عابد علی عابد

آنکھوں کا آئینہ ہے وہ نایاب آئینہ
ہوتی نہیں ضرورت اسباب آئینہ

چشم زدن میں خاک ہوئی جلوہ گاہ طور
دل ہے صحیح معنوں میں اسباب آئینہ

والد کی ہر خصوصیت آئی پسر میں تھی
رستم کا ہر طرح سے تھا سہر اب آئینہ

سج دھج کے جانا چاہیے آئینے کے قریب
خوباں سے سیکھ لیجئے آداب آئینہ

آتی نہیں نظر انھیں خود اپنی خامیاں
عابد ہمیں دکھاتے ہیں احباب آئینہ

نسیم محمد جان

ایک نظم (تشدد کے نام)

جی چاہتا ہے
نام اپنا
بے نام کردوں
اور لوگوں سے کہوں
میں انسان ہوں
یہی میری پہچان ہے
اگر تم لوگ چاہو
میرے جسم کے ٹکڑے کرو
ہر ٹکڑے پر اپنے مذہب
اور
قومیت کا نام لکھ دو
میں قبول کرلوں گا

شاعری

غزلیں

راشدانورراشد

ہزار شکر کہ نقصان میں نہیں رکھا
کوئی بھی عیب مری جان میں نہیں رکھا

موازنہ کیا کرتاہے قیس سے جس نے
قدم کبھی بھی بیابان میں نہیں رکھا

سجاکے رکھا ہے دل کے نفیس گوشے میں
انا کے گملے کودالان میں نہیں رکھا

شکایتیں کیا کرتا ہے شہر کا قاضی
کوئی بھی جلسہ مری شان میں نہیں رکھا

ہم اپنی نیکی کو دریا میں ڈال آئے ہیں
کیا جو کچھ بھی کبھی دھیان میں نہیں رکھا

جو دل میں آیا وہ بے خوف کہہ دیا لیکن
کسی نے ہاتھ گریبان میں نہیں رکھا

فسانہ پورا ہی سننا پڑے گا مجبوراً
کوئی اشارہ بھی عنوان میں نہیں رکھا

ہر ایک لمحہ معطر تھا جس سے باغ خیال
اسی گلاب کو گلدان میں نہیں رکھا

وہی غزل مری پہچان بن گئی جس کو
فضول جان کے دیوان میں نہیں رکھا

ہاں یقیناً ہیں طرحدار ترے شہر کے لوگ
کیوں مگر مجھ سے ہیں بیزار ترے شہر کے لوگ

میں نے خوابوں کے گھروندوں کو بنایا جب بھی
روندے آئے کئی بار ترے شہر کے لوگ

عشق خوشبو سے بھی سرشار نہیں ہوتے ہیں
مجھ کو کچھ لگتے ہیں بیمار ترے شہر کے لوگ

ایک عرصے سے ہوتا بازار میں نایاب مگر
بن کے آئے ہیں خریدار ترے شہر کے لوگ

ان کے قبضے میں کبھی میں نہیں آیا ورنہ
بانٹتے در ہم و دینار ترے شہر کے لوگ

میں کبھی کرتا نہیں اپنی انا کا سودا
کیوں ہیں پھر میرے طرفدار ترے شہر کے لوگ

سیدھے منہ بات نہیں کرتے سدا رہتے ہیں
مارنے مرنے کو تیار، ترے شہر کے لوگ

زندگی لوٹے، کوئی ظلِ الٰہی مل جائے
ہیں سجائے ہوئے دربار ترے شہر کے لوگ

میں محبت کی زبان بول رہا ہوں لیکن
مجھ کو کرتے ہیں خبردار ترے شہر کے لوگ

جب ضرورت تھی تو غفلت کا نشہ طاری تھا

شاعری

غزلیں

جمال قدوسی

ہر کوئی آج مری جان کا خواہاں نکلا
میں ہی اس شہر میں سرباز نمایا ں نکلا

خون الفاظ و معانی سے ٹپکتے ہیں سدا
شعر بھی میرا مرے جیسا مسلماں نکلا

میں سمجھتا تھا جسے سب سے بڑا اپنا عدو
تری محفل میں وہی میرا مہرباں نکلا

ساقیا! کون سی مئے آج پلا دی تو نے
ترے میخانے سے ہر شخص ہراساں نکلا

کوئی قیمت نہ کوئی مول نہ پرساں کوئی
ایک میرا ہی لہو سب سے ہی ارزاں نکلا

بے ضرر پھول کے مانند ہیں بستی والے
آج اپنا ہی ہر اک بات میں عصیاں نکلا

مہتاب قدر

ہر ایک سمت اندھیرا بہت اندھیرا ہے
کوئی تولائے سویرا بہت اندھیرا ہے

فصیل شہر پہ پہرا بہت اندھیرا ہے!
امیر شہر ہے اندھا بہت اندھیرا ہے

یہ جگنوؤں کی چمک ہے اسے سحر نہ کہو
نہیں یہ دور سنہرا بہت اندھیرا ہے

کسی بھی شاخ پہ الو نہیں ہے کوئی مگر
فریب و مکر کا ڈیرا بہت اندھیرا ہے

لگے جگہ جگہ پہ اندھیروں کے ناگ ڈسنے
بلاؤ کوئی سپیرا بہت اندھیرا ہے

وہ جس کی آنکھوں میں اشکوں کے دیپ جلتے تھے
کوئی بھی اشک نہ ٹھہرا بہت اندھیرا ہے

شاعری

غزلیں

منصور خوشتر

دردِ دل، زخمِ جگر کا راز داں کوئی نہیں
واقفِ اسرارِ غم، آزارِ جاں کوئی نہیں

ہجر کی رات بسر ہو تو گئی
ظلمتِ شب کی سحر ہو تو گئی

پاس جس کے کچھ نہیں مال و متاعِ بے بہا
اُس کو کیا غم کہ محافظ، پاسباں کوئی نہیں

رہتی غیر وں پہ عنایت بھی سہی
اک نظر اُس کی اِدھر ہو تو گئی

کیا سلوک ہمسائے کا بتلائے اک خانہ بدوش
بے در و دیوار سا جس کا مکاں کوئی نہیں

راز مجھ سے ہی چھپانا کیسا
مجھکو ملنے کی خبر ہو تو گئی

داد کے لائق امیرِ شہر ہی کی ذات ہے
کیونکہ اب فُٹ پاتھ پر بھی بے اماں کوئی نہیں

رہ گزر ،کوئی شبستاں بھی نہیں
دور کو چے سے بسر ہو تو گئی

خانۂ دل تک مرے کوئی گیا تو ہے ضرور
نقشِ پا کا چھوڑا ہے لیکن نشاں کوئی نہیں

مانتا ہوں کبھی موہوم تھی وہ
میرے چھونے سے کمر ہو تو گئی

روز کچھ ایسے گزرتے اِس جہاں سے ہیں ضرور
ہائے جس کا رونے والا، نوحہ خواں کوئی نہیں

چشمِ جاناں میں مروت کیسی
مہرباں مجھ پہ مگر ہو تو گئی

آبرو اللہ نے خوشتؔر جبیں کی رکھّی ہے
جس کا اُس در کے سوا ہے آستاں کوئی نہیں

نم نہیں ہوتی تھی خوشتؔر جو آنکھ
آج کیا بات ہے تر ہو تو گئی

شاعری

غزلیں

شارق عدیل

اپنے خستہ حال پر ایک ایک در روتا ہوا
دید کے قابل ہے بارش میں کھنڈر روتا ہوا

شہر پر نازل ہوئی تھی اک بلا مدّت ہوئی
کوئی اب تک پھر رہا ہے دربدر روتا ہوا

بے صداقت زندگی میں کیا بہاریں آگئیں
ہنس پڑا ہے یک بیک آئینہ گر روتا ہوا

پاس اس کے حوصلہ تھا اور نہ تھا زادِ سفر
کون گزرا راہ سے بے بال و پر روتا ہوا

اس کی خاطر چھوڑنا ہوگا مجھے اپنا وطن
دیکھوں کب تک خود میں احساس ہنر روتا ہوا

ایک دن رستے میں شارق رات گہری کیا ہوئی
لوٹ کر آیا تو دیکھا گھر کا گھر روتا ہوا

جو تم کو امتحاں تنہائی کا لینا ضروری تھا
کسی صحرا کو اپنا گھر بنا لینا ضروری تھا

چراغ رہ گزر روشن کیا تھا اس لیے ہم نے
ہوائے خیر و شر کا جائزہ لینا ضروری تھا

حدوں سے جب تجاوز کر رہے تھے آپسی جھگڑے
فصیلیں گھر کے آنگن میں اٹھا لینا ضروری تھا

زمیں پر ڈھیر ہوتے ہی فصا محبوس کر ڈالی
درختوں کا ہوا سے خوں بہا لینا ضروری تھا

اگر تم غزل کے زندگی میں رنگ بھرنے تھے
کسی کے دل کو اپنا دل بنا لینا ضروری تھا

گلے میں قوم کے سادہ روی ہی طوق بن جاتی
ذرا سے جھوٹ کو شارق نبھا لینا ضروری تھا

نظمیں

شاعری

مسعود جعفری

محرم کا چاند دیکھ کر

شہادت نینوا کی یاد کر لیں
بیاں پھر درد کی روداد کر لیں
چلو پھر سے انہیں بھی یاد کر لیں
ہم اپنا گھر ذرا برباد کر لیں
یہی پیغام ہے سبط نبی کا
حصار جبر سے آزاد کر لیں
کہاں کی عید کیسی دل نوازی
دھڑکتا دل ذرانا شاد کر لیں
سنے گا کون اپنی بے نوائی
سر دربار بھی فریاد کر لیں
یزیدو آو دریا کے کنارے
ستم پھر اک نیا ایجاد کر لیں
پرندے چھوڑ دیں گلشن پرستی
غموں کی بستیاں آباد کر لیں
نہ چھوٹے گا غم شبیر ہم سے
ازل سے تاابد بے داد کر لیں
نہ برسیں اوس کے قطرے چمن میں
گل و شمشاد بھی فریاد کر لیں
یزیدی لشکری آنے نہ پائے
کلی کی ٹہنیاں فولاد کر لیں
اٹھے گا شور ماتم جعفری پھر
ہم اپنی دربدر اولاد کر لیں

رند سرشار

ایک دعا

میرے آنگن کا بوڑھا پیڑ محو دعا یوں تھا
میرے مولا!
جو پودے ننھے ننھے انہیں مجھ سے بڑا کر دے
میرے سائے کی ٹھنڈک اور جاں بخشی انہیں دے دے
میرے پتوں کی روشن خلعتیں ان کو عطا کر دے
اور ان پودوں کی شریانوں میں میرا خون دوڑا دے
میرے مولا!
میری خواہش خلافِ مصلحت گر ہو
مجھے ہی کسی ننھے پودوں سا کسی بونے کا قد دے دے
خطا سر بلندی پر میرا سر قلم کر دے

شاعری

غزلیں

احمد نثار

سرکش ہوا نے شہر کو دصدمہ بنا دیا
تھا جو چراغ مثل ستارہ بجھا دیا

زر خیز ہو تو آئے مرے جسم و جاں کو چین
مٹی کو ہم نے اپنا لہو تو پلا دیا

جو تھے دراز قد وہ تو دریا میں بہہ گئے
موجوں نے خارو خس کو کنارے لگا دیا

ہے زعم میں بہت تو ذرا رُخ ادھر کرے
جا کر ہوا کو بول ، بجھائے مرادیا

خود سبزہ زار اپنی جڑیں کھو دنے لگے
اب کے خزاں نے سب کا کلیجہ ہلا دیا

سب کشتیوں کو بحر کی موجیں نکل گئیں
تنکے کو رب نے میرا سہارا بنا دیا

کوئی نہ ڈھونڈ پائے گا مجھ کو کسی طرح
میں نے نثارؔ نقشِ کفِ پا مٹا دیا

ادھر سے جب کوئی گذرا نہیں تھا
یہ منظر اس قدر تشنہ نہیں تھا

کئی طوفاں قطرے سے عیاں تھے
تری آنکھوں سے جو ٹپکا نہیں تھا

تحمل سے لیا ہے کام ہم نے
ہمارا خون کیا کھولا نہیں تھا

تمہاری بزم سے اٹھ کر گیا جو
وہ اعلیٰ ظرف تھا ادنیٰ نہیں تھا

دعا اس کی مجھے گھیرے ہوئی تھی
وہ چہرہ جس کو میں پڑھتا نہیں تھا

بہت اسی شخص سے اب انسیت ہے
مرا جس سے کوئی رشتہ نہیں تھا

کوئی امید بھی روشن نہیں تھی
مرے قدموں تلے رستہ نہیں تھا

مطالعہ

مرزا خلیل احمد بیگ

مجلّہ 'ادب وثقافت' کا پانچواں شمارہ

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی ' حیدرآباد کے ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل 'ادب و ثقافت' کا پانچواں شمارہ بدست ہے۔ دو سال قبل جب اس تحقیقی مجلّے کا اجراء عمل میں آیا تھا تو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ حیرت اس بات کی تھی کہ اس عملی کساد بازاری کے دور میں اتنے معیاری' معتبر اور منفرد رسالے کا نکالنا کیوں کر ممکن ہو سکا جو ضخامت کے اعتبار سے بھی اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دو تین شماروں کے بعد یہ دَم توڑ دے گا (جیسا کہ اُردو کے اکثر رسالوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے کہ شائع ہونے کے کچھ دنوں کے بعد یا تو وہ گنڈے دار ہو جاتے ہیں یا بالکل ہی بند ہو جاتے ہیں)۔ خدا کا شکر ہے کہ 'ادب وثقافت' کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ رسالہ پروفیسر محمد ظفر الدین جیسے زیرک اور صحافتی سوجھ بوجھ اور تجربہ رکھنے والے لائق مدیر کی زیر ادارت نکلنا شروع ہوا ہے' لہٰذا اس کے شعلۂ مستعجل بن جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اردو میں رسائل و جرائد کی کوئی کمی نہیں' لیکن ایک ایسا جریدہ جس کی حیثیت وافادیت ریفریڈ جرنل کی ہو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد کو اس بات کا شدت سے احساس تھا اور ان کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ انگریزی اور دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی ایک ایسے جرنل کا وجود عمل میں آئے جو تحقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ ریفریڈ بھی ہو جس سے اردو زبان وادب اور تہذیب وثقافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے ذوق کی تسکین بھی ہوتی رہے اور طلبہ وتحقیق کار مستفید ہوتے رہیں' چنانچہ بڑی آب وتاب اور حسن وخوبی کے ساتھ اس کے چار شمارے یکے بعد دیگرے پابندی کے ساتھ شائع ہوتے گئے۔ زیر نظر شمارہ اس کا پانچواں شمارہ ہے جو اسی مہینے میں (ستمبر 2017 میں) شائع ہوا ہے۔ اس کے سرپرست اعلیٰ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز' شیخ الجامعہ' مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) ہیں' اور اس کے سرپرست ڈاکٹر شکیل احمد' نائب شیخ الجامعہ' مانو ہیں۔ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں پروفیسر شمیم حنفی (نئی دہلی)' پروفیسر شارب ردولوی (لکھنو)' پروفیسر عتیق اللہ (نئی دہلی)' پروفیسر بیگ احساس (حیدرآباد)' پروفیسر نسیم الدین فریس (حیدرآباد)' پروفیسر عبدالستار دلوی (ممبئی)' پروفیسر اشرف رفیع (حیدرآباد)' پروفیسر م۔ن۔ سعید (بنگلور)' پروفیسر وہاب قیصر (حیدرآباد) اور جناب انیس اعظمی (حیدرآباد) کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

شذرات کے تحت پروفیسر محمد ظفر الدین نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی بات کہی ہے اور اصطلاحاتِ علمیہ کے بارے میں اپنے موقف کو کھل کر بیان کیا ہے۔ ان کی یہ بات قابلِ غور وفکر ہے کہ ''اردو ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہے' مادری زبان میں علم سیکھنے کی قوت وافادیت آج بھی برقرار ہے' لیکن اصطلاحات اور اسماء کے ترجمے پر اصرار ہمیں ترقی کی راہ میں پیچھے کی طرف دھکیل سکتا ہے۔''

'ادب وثقافت' کے اس شمارے کے مشمولات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے قلمی معاونین میں اردو کی جانی پہچانی اور معروف شخصیتیں شامل ہیں جنھوں نے اپنے اپنے علمی میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور تحقیق وتنقید اور

سماجی علوم میں امتیاز حاصل کیا ہے۔ان شخصیتوں کے نام ان کے مضامین کے ساتھ یہاں درج کیے جاتے ہیں: 1) پروفیسر افصح ظفر (کلچر، ادب اور جنگ)، 2) پروفیسر حسین الحق (ضمیر الدین احمد کا افسانہ 'پروائی': ایک تجزیاتی مطالعہ)، 3) پروفیسر نریش (جدید ہندی شاعری کی مختلف اصناف میں اردو کے عناصر)، 4) پروفیسر علی رفاد فتیحی (لغت سازی)، 5) پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین (چند ہم عصر کہانیاں اور ان کے سماجی سروکار)، 6) جناب اسیم کاویانی (مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری: ایک جائزہ)، 7) ڈاکٹر مصطفیٰ علی خاں فاطمی (مہاراجہ شاد اور علامہ اقبال کے خطوط)، 8) ڈاکٹر خالد اشرف (اختر الایمان کی شاعری کی قدر شناسی)، 9) ڈاکٹر اسلم جمشید پوری (ہندوستانی تہذیب اور اردو شاعری)، 10) ڈاکٹر محمد کاظم (ڈراما انارکلی: ایک مطالعہ)، 11) ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی (اقبال سہیل کا تصورِ غم)، 12) ڈاکٹر وسیم بیگم (علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کی مختلف جہات)، 13) ڈاکٹر غلام حسین (عمیق حنفی کا عہد اور ادبی تناظر: ایک جائزہ)، 14) ڈاکٹر محمد جنید ذاکر (دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے سو سال)، 15) ڈاکٹر الطاف انجم (کشمیری زبان کی تنقید پر اردو کے اثرات)، 16) ڈاکٹر محمد مستمر (اردو غزل میں ہندوستانی عناصر: 1980ء کے بعد)۔

یہاں ہر مضمون کے بارے میں فرداً فرداً کچھ کہنا بے محل ہوگا، کیوں کہ پروفیسر محمد ظفر الدین 'شذرات' میں ان کا بخوبی جائزہ پیش کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ تمام مضامین بڑی دقت نظر کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ان میں تحقیقی مضامین بھی ہیں اور تنقیدی و تجزیاتی بھی۔ بعض مضامین تقابلی نوعیت کے ہیں۔ بعض مضامین شخصی حوالوں سے لکھے گئے ہیں، مثلاً علامہ شبلی، اقبال سہیل، اختر الایمان، عمیق حنفی، مجتبیٰ حسین اور ضمیر الدین احمد وغیرہ پر مضامین، لیکن ان میں بھی تحقیقی و تنقیدی عنصر نمایاں ہے۔ ادب، کلچر اور ہندوستانی تہذیب کے حوالے سے جو مضامین اس شمارے میں شامل ہیں وہ بھی بہت خوب ہیں۔ ترجمے اور لغت سازی سے متعلق مضامین میں بھی کافی تحقیق اور چھان بین سے کام لیا گیا ہے۔

الغرض، 'ادب و ثقافت' کا یہ شمارہ ہر اعتبار سے ایک مفید، وقیع اور قابل قدر شمارہ ہے جس کی علمی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ ایک خوش آئند بات جس کا ذکر مدیرِ رسالہ نے اپنے شذرات میں کیا ہے یہ ہے کہ ''یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس جریدے کو اپنے منظور شدہ جرائد کی فہرست میں اردو اور ترجمے کے زمروں میں شامل کر لیا ہے۔'' میں اس فقید المثال رسالے کے خوب سے خوب تر بننے کا متمنی ہوں اور اس کی درازی عمر کے لیے دعا کرتا ہوں۔

OOO

ساہتیہ اکادمی

کے زیر اہتمام

ہندوستانی ادب کے معمار

کے سلسلے کی ایک کڑی

شاذ تمکنت

بیگ احساس

قیمت: 40 روپے

ملنے کا پتہ: رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ،

نئی دہلی، 001 110

سیلس آفس، سواتی مندر مارگ، نئی دہلی 001 110

مطالعہ

مکالمات پر ایک مکالمہ

رؤف خیر

جناب جاوید یزدانی بڑے بے باک صحافی ہیں۔حق گوئی و بے باکی ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ انھوں نے صاف صاف فرمایا کہ ہندی میں ''بھوپال ہلچل'' کو انھوں نے ذریعہ معاش بنایا تھا مگر 'اردو ہلچل'' کے ذریعے وہ زبان وادب کی خدمت کر کے تسکین حاصل کر رہے ہیں۔ الحمدللہ اب اردو صحافت گھاٹے کا سودا نہیں رہ گئی ہے گویا ربّنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی لاآخرة حسنة ۔اور اگر ایمان داری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے تو پھر ''وَقِنا عَذاب النّار'' بھی نصیب ہوگا۔

کچھ صحافیوں نے اردو صحافت وترویج واشاعت سے دوہرے فائدے اٹھائے ہیں جیسے منشی نول کشور نے جہاں اردو پر احسان کیا، مسلمانوں پر احسان کیا وہیں اردو نے بھی ''ھل جزاء الاحسان الا الاحسان '' کے قاعدے کے تحت انھیں بھی دولت وشہرت سے نوازا۔ یہی حال ''زمانہ'' کے دیا نارائن نگم اور ''رہنمائے تعلیم'' کے ماسٹر جگت سنگھ کا بھی ہے۔ پنجاب سرکار کے تمام مدرسوں اور کتاب خانوں کے لیے رہنمائے تعلیم کی سیکڑوں کاپیاں خریدی جاتی رہی ہیں۔اس طرح غیر مسلموں نے بھی اردو کی خدمت کا معقول صلہ پایا۔اس میں ماہ نامہ بیسویں صدی کے رام رکھا خوشتر گرامی کا نام جوڑ لیا جا سکتا ہے۔آج بھی کئی رسالے اپنے ''گوشوں'' کے سہارے زندہ ہیں بلکہ خود ان مدیروں کی ادب میں ''آمد'' اور ''ادبی محاذ'' پر ڈٹے رہنے میں اردو صحافت نے اہم حصہ ادا کیا ہے۔محض شعر وادب کی بنیاد پر تو ایسے مدیروں کو بہت کم جانا جاتا تھا۔آج ان کے رسالوں کی وجہ سے ان کی رسائی دور دور تک ہو رہی ہے اور جن کے گوشے نکالے جاتے ہیں وہ بھی ان خریدے ہوئے گوشوں کی وجہ سے گوشہ نشینی سے باہر نکل آئے۔اس ''گوشہ گیری'' و ''گوشہ فروشی'' سے شعر وادب کا بھلے ہی فروغ ہو نہ ہو اردو صحافت کو ضرور مالی فائدہ ہوا ہے۔ جناب جاوید یزدانی بڑی ایمانداری سے ہر ماہ اردو ہلچل نکال رہے ہیں۔کاروان ادب سے بھی وہ ادب کی خدمات کر رہے ہیں۔انھیں اور ہمیں بھی نعیم کوثر صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ وہ جاوید یزدانی صاحب سے اپنا سونپا ہوا ''صدائے اردو'' نہ واپس لیتے نہ جاوید صاحب اردو ہلچل پیدا کرتے۔

صحافت سے وابستگی انٹرویو کرواتی ہی ہے۔ چناں چہ جاوید یزدانی نے بھوپال کی اہم شخصیات سے شعر و ادب کے حوالے سے مکالمات قایم کیے نتیجے میں بڑے اہم انکشافات منظر عام پر آئے۔ ان مکالمات میں سیفی سرونجی اور چندر بھان خیال بھوپال سے کچھ زیادہ دور کے قلم کار نہیں ہیں البتہ شمیم طارق قدرے فاصلے کے ادیب ہیں۔کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم جسے علی گڑھ، دہلی، لکھنو، کلکتہ کا ادیب شاعر سمجھتے ہیں اس کا تعلق بھی بہار شریف سے نکل آتا ہے۔ علاقائی محبتیں بہت بڑی سند Qualification ہوتی ہیں۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

مکالمات کے ''مصاحبین' کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے پروفیسر آفاق احمد کے بارے میں جاوید یزدانی نے لکھا کہ وہ نہ صرف ایک ممتاز وکہنہ مشق ادیب ہیں بلکہ ''خوب صورت' شاعر بھی ہیں۔ آفاق صاحب کے تعلق سے ان کی رائے سے ہمیں اختلاف ہے۔ ہمارا خیال ہے شاعر کے لیے خوب صورت ہونا ضروری نہیں ورنہ وہ زبیر رضوی ہو کر رہ جاتا ہے جنھوں نے اپنی خود

نوشت میں یہ اعتراف کیا ہے کہ فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی بھی ان کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ البتہ شاعر کی شاعری خوب صورت ہو جیسے جگر مرادآبادی کی شاعری جو خود تو سیاہ فام و بدصورت تھے مگر شاعری دل نشین ہوا کرتی تھی۔

آفاق صاحب کے انٹرویو میں ایک اور کڑوی حقیقت سامنے آئی کہ بھوپالی جن کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں وہی ان کو کم تر درجے کی چیز سمجھتے ہیں۔ یہ صورتِ حال تقریباً ہر جگہ ہے۔ بہار کے ادیبوں شاعروں کو شمال کے قلم کار بھی چشم کم سے دیکھتے ہیں جب کہ اخلاق و کردار میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ نظام دکن سے آج تک دکنیوں نے بھی اہل شمال کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں کی۔ اہل شمال مگر اہل دکن کو کسی قابل ہی نہیں سمجھتے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ اختر سعید خان انکم ٹیکس ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہائی کورٹ جج بننے سے محروم کر دیئے گئے۔ لاکھوں روپئے ڈونیشن دے کر ڈاکٹر بننے والا کسی کارپوریٹ ہاسپٹل میں خدمات انجام دیتے ہوئے سارا خرچ مع سود وصول کر لیتا ہے۔

یہ بھی انکشاف ہوا کہ آفاق احمد پی ایچ ڈی نہ ہونے کے باوجود پروفیسر رہے جیسے آل احمد، سرور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ کئی قابل پی ایچ ڈی ہونے کے باوجود کسی یونیورسٹی میں خدمات کے لیے منتخب نہیں کیے جاتے۔ ہماری ایک یک مصرعی نظم یاد آرہی ہے۔ جس کا عنوان ہے ''سفارش'' ہر سند سے بڑی سفارش ہے۔

ایک اور آفاق حسین صدیقی نے بڑے پتے کی بات کہی کہ ''علم و ادب وراثت میں نہیں ملتا''۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ بعض شاعر اپنی جوان بیٹی یا بیٹے کو مالی فائدے کی خاطر کل ہند مشاعروں میں لانچ کر رہے ہیں۔

آفاق حسین صدیقی نے اس غلط فہمی کی بھی تردید کی کہ نسخہ حمیدیہ دیوان غالب کا قلمی نسخہ ہے بلکہ مطبوعہ ہے جسے نواب محمد حمیداللہ خان کی ایما پر مفتی انوارالحق نے مرتب کیا تھا۔

اقبال مجید نے اپنے انٹرویو میں فرمایا کہ بھوپال کے کئی لکھنے والوں کو انھوں نے آل انڈیا ریڈیو بھوپال پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ بھوپال کا سب سے اچھا اور بہترین افسانہ نگار تو پاکستان چلا گیا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ کون تھا؟ اور پاکستان میں اس کا کیا حشر ہوا؟ ہمیں پھر اپنا ایک شعر یاد آرہا ہے جو 1986ء میں ٹی وی پر پڑھا گیا تھا

مہاجرین سے انصار خوش نہیں ہوتے!
تو پھر کہاں کی یہ ہجرت، بُرا ہے بھارت کیا

آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے اردو پروگرام ایکزیکیٹیو نے بڑی صاف گوئی بلکہ سفاکی سے کہہ دیا کہ اردو اخبارات و رسائل کے نام پر ان کے گھر روز نامہ ندیم کا صرف سنڈے ایڈیشن آتا ہے اور یہ کہ ان کے گھر پر لگی ان کے نام کی اردو تختی انھوں نے نکال پھینکی ہے مگر شکر ہے اردو والوں نے انھیں اپنی فہرست سے خارج نہیں کیا۔ مکالمات میں ان کی شمولیت اس کی گواہ ہے۔ آج بھی ''چہارسو'' انھیں کچھ لوگ جانتے ہیں۔

چندر بھان خیال اگر یہ کہتے ہیں کہ ان کے بعد ان کی شاعری کی وراثت سنبھالنے والا کوئی وارث نہیں تو اس میں تعجب کی بات نہیں۔ اردو پر کبھی اقبال تھا اب تو ادبار ہی ادبار ہے۔

پروفیسر خالد محمود نے سفرناموں پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ فرماتے ہیں یوسف خاں کمبل پوش کے ''عجائبات فرنگ'' سے تا حال بے شمار سفرنامے لکھے جا چکے ہیں۔ گوجرانوالہ (پاکستان) کے ایک ہی کتب خانے نے ''عجائب الاسفار'' کے نام سے جو فہرست شائع کی ہے اس میں بارہ سو سفرناموں کا ذکر ہے۔

لاہور سے ماہ نامہ الحمرا جو آتا ہے اس کے ہر شمارے میں دو چار سفرنامے قسط وار شائع ہوا کرتے ہیں۔ اسی لیے خامہ بگوش نے کسی کے سفرنامے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا ادیبوں کو

ویزا جاری کرتے ہوئے یہ شرط رکھی جائے کہ پاکستان واپسی پر وہ سفرنامہ نہیں لکھیں گے۔ ہر کس و ناکس خودنوشت اور سفرنامہ لکھنے لگا۔ہمیں پھر اپنے دوشعر یاد آرہے ہیں:

بازارِ سخن میں تری اوقات ہی کیا ہے
ناداں تری رودادِ سفر کون پڑھے گا
وہ لکھنے لگے ہیں جنھیں پڑھنا نہیں آتا
ہر شخص ہی لکھے گا اگر کون پڑھے گا

یوں تو مکالمات میں کئی لکھنے والوں سے انٹرویو لیے گئے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں جیسے دیوی سرن، رشید انجم، رضیہ حامد، حکیم ظل الرحمٰن، سیفی سرونجی، شاہد میر، شمیم طارق، عارف عزیز، کوثر صدیقی، خالد عبادی، محمد نعمان خان، مختار شمیم، نثار راہی، نصرت مہدی، نعیم کوثر وغیرہ۔ مگر بعض انٹرویو چونکاتے ہیں ہمارا سروکار ایسے ہی ادیبوں شاعروں سے ہے۔

رشید انجم کی وابستگی ڈرامے اور فلم سے ہے۔ادب میں وہ ''نا ادھر کے رہے نہ اُدھر کے'' انھوں نے شاعری بھی کی۔کئی جاسوسی ناولوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ بے شمار فلمی شخصیتوں پر بھر پور مضامین پر مشتمل ان کی ضخیم کتاب ان کی عرق ریزی کی دستاویز ہے۔''ادب سے فلم تک'' ان کی ریسرچ کا ایسا شاہ کار ہے جس پر کسی بھی یونیورسٹی سے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل سکتی تھی اگر انھوں نے کوشش کی ہوتی۔ یہ کتاب ایسی فلمی ہستیوں کے کارناموں کی تحقیق ہے جن کی ادبی حیثیت بھی مسلمہ ہے (ان کے بارے میں ہمارے پہلے جملے کا لطف وہی اٹھا سکتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ رشید انجم نے اپنا طنزیہ و مزاحیہ ڈرامہ ''نا ادھر کے رہے نہ اُدھر کے'' دراصل تیسری جنس کے تعلق سے لکھا تھا جو کافی مقبول ہوا تھا)۔

بھوپال کی ڈاکٹر رضیہ حامد ادب کی شاہجہاں بیگم سے کم نہیں۔ یہ ''فکر و آگہی'' کی چوٹی پر ہیں۔ان کی بے شمار کتابیں ان کی علمیت کی غماز ہیں۔انھوں نے اپنے معتبر و مستند رسالے ''فکر و آگہی'' کے کئی خاص نمبر خاص شخصیات پر نکال کر بھوپال کا نام روشن کیا۔آپ نے بھوپال کے مشہور ممتاز عالم بے بدل نواب صدیق حسن خان صاحب کی علمی فتوحات کی داد تحقیق دے کر ان کی ہمالیائی شخصیت کا احساس دلایا ورنہ عموماً لوگ ان کے مذہبی کارناموں کو پس پشت ڈال دینا چاہتے ہیں کہ حق گوئی و بے باکی ہر دور میں کھلتی رہی ہے۔

مکالمات میں صرف دو ہی خواتین کے انٹرویو لیے گئے ہیں۔رضیہ صاحبہ کے علاوہ نصرت مہدی ہیں جو مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کی سکریٹری ہیں۔اس حیثیت سے انھیں کئی مشاعروں میں مدعو کیا جاتا ہے۔انھوں نے اکاڈمی کو متحرک کیا اور اردو کی دامے درمے سخنے خدمت کر رہی ہیں۔ وہ ایک علمی گھرانے سے آئی ہیں۔ان کی بہن بھی شاعرہ ہیں۔

پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن کا بھوپال سے تعلق ہے گر وہ برسوں سے علی گڑھ میں مقیم ہیں وہاں انھوں نے سینا اکاڈمی قایم کی اور علم و حکمت کی بے شمار نایاب کتابیں جمع کیں طب کے علاوہ غالبیات پر بھی قابل قدر ذخیرہ یہاں موجود ہے۔

ڈاکٹر سیفی سرونجی Self Made آدمی ہیں۔ بڑی جدو جہد تگ و دو اور محنت سے وہ مقام حاصل کیا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ایسے سادہ لوح قلم کار ہیں کہ بے تکلف اپنے بارے میں سب کچھ کہہ گزرتے ہیں۔''انتساب'' کے ذریعے سرونج سے پرواز کر کے لندن تک پہنچے۔''علمی زبان'' بھی آپ ہی کی سرپرستی میں فروغ پا رہا ہے۔سیفی صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔کئی ادیبوں شاعروں پر انتساب کے گوشے بھی نکالے جو بہت مقبول ہوئے۔

ڈاکٹر شاہد میر شاعر مغنی اور سائنس کے استاد ہیں۔ سرونج سے راجستھان تک آپ کے شاگرد اور چاہنے والے پھیلے

ہوئے ہیں۔

شمیم طارق نے سمیناروں اور مشاعروں کی سیاست پر کھل کر کہا کہ:

''اکّا دُکّا مشاعروں کو چھوڑ کر ان کا زبان سے، ذوق سے، ادب سے، تہذیب سے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا۔ بھیڑ کو تفریح اور مشتعل کرنے والے جملے اور مصرعے پسند ہیں۔ سمینار بھی لین دین کی بنیاد پر منعقد ہوتے ہیں انھوں نے کہا صحت منداجزا نے اردو ادب کو فائدہ پہنچایا۔ جن کی صحت مشکوک تھی وہ وقت کے ساتھ مسترد کر دیئے گئے۔ سمندر بھی مردوں کو باہر پھینک دیتا ہے۔ شمیم طارق نے غالب اور ہماری تحریک آزادی، صوفیہ کی شعری بصیرت، تصوف اور بھکتی، غالب اور بہادر شاہ ظفر اور انجمن اسلام ممبئی اس کی کریمی لائبریری جیسی کتابیں اردو ادب کو دی ہیں۔

جناب عارف عزیز بھوپال کے سینئر صحافی ہیں اور کئی اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے ہیں تنقید وتحقیق سے عبارت آپ کی تقریباً دس کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ آپ کا قلم جوان ہے۔

بھوپال کے بزرگ صحافی شاعر و مترجم جناب کوثر صدیقی نے بتایا کہ ان کے بھائی قیصر الجعفری کوثر صاحب کی شاعری کے بارے میں ہمیشہ منفی سوچ رکھتے تھے۔ کوثر صاحب نے رباعی کی بحر میں تین مصرعوں کی صنف ایجاد کی جسے اسلم حنیف نے ترانہ کا نام دیا مگر ترانہ اور دو بیتی تو رباعی کے نام ہیں۔ اسی لیے یہ ثلاثی ہیں۔ کوثر صاحب تو صدیقی ہیں مگر ان کا بیٹا رومی جعفری ہے! بھائی بھی قیصر الجعفری۔ یہ افتراق سمجھ میں نہیں آیا۔

خالد عبادی آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے وابستہ رہے۔ کئی قلم کاروں کے انٹرویو لیے۔ ان کے دادا محمد صادق دیوبند میں محدث تھے اور والد مشہور ٹیلر دل آرام اینڈ سنس کے مالک ان کے گھر دین دنیا اور آستانہ رسالے آتے تھے مگر خالد عبادی فلمی پرچوں میں مگن رہتے تھے۔ جیسے شمع، روبی، فلم فیئر، سکرین، چترا، کہکشاں، فلمی کلیاں، فلمی پریاں وغیرہ۔

بھوپال کی ادبی شناخت ان دنوں نعمان خان اور مختار شمیم جیسے صاحب نظر تنقید نگاروں سے قائم ہے۔ نعمان خاں صاحب اردو ادب کی درسی کتابوں کی ترتیب کے لیے SCERT، NCERT جیسے اداروں سے بلائے جاتے ہیں۔

پروفیسر مختار شمیم جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے نثر نگار۔ ظہیر دہلوی پر آپ نے دادِ تحقیق دی جو بہت جامع ہے اور جو پروفیسر ابو محمد سحر کے زیر نگرانی لکھا گیا تھا جس پر مختار شمیم کو پی ایچ ڈی کی سند ملی۔ یہ مقالہ مونوگراف کی صورت میں کافی مقبول ہے۔

نثار راہی ایڈووکیٹ نے کہا کہ کئی لوگ خواہ مخواہ پٹھان بنے پھرتے ہیں۔ ان کے نسب کی جانچ ہونی چاہیے۔ ان کے افسانے جنس SEX کے گرد گھومتے ہیں۔ انھیں شکوہ ہے کہ اردو اکاڈمی کی کارکردگی یک دم ناقص ہے اور جینوین تخلیق کاروں کے بجائے نااہلوں کو انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال تقریباً ہر اکاڈمی کی ہے۔ نثار راہی نے بتایا کہ وہ افسانے لکھتے ضرور ہیں مگر چھپنے کے لیے رسائل کو کم کم بھیجتے ہیں۔

جناب نعیم کوثر ماہ نامہ بیسویں صدی کے مستقل افسانہ نگار کوثر چاند پوری کے بیٹے ہیں۔ مکالمہ کراچی کے ضخیم افسانہ نمبر میں ان کی کہانی بار پا گئی مگر ان کے والد کی کہانی شامل نہیں ہو سکی۔ ان کا رسالہ صدائے اردو بڑی مشکل سے چھپتا ہے۔ ایک بھوپال ہی کیا پورے ملک میں اردو روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ نعیم کوثر صاحب نے کہا کہ وہ اپنے افسانے کو ذہنی شعبدہ گری اور فلسفیانہ گورکھ دھندے سے دور رکھتے ہیں۔

مکالمات کے ذریعے اس میں شامل ادیبوں، شاعروں کے ذہن اور ان کی ذہنیت سے آگہی حاصل ہوتی ہے کہ ہر قلم کار اپنی تحریروں سے جھانکتا ہے اور جاوید یزدانی صاحب نے ایسے تمام قلم کاروں کو قاری کے روبرو کیا ہے۔

(مراسلہ نگار کے خیالات سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

جو وہ لکھیں گے جواب میں

کرم فرمائے من برادرم ڈاکٹر بیگ احساس صاحب ___ آداب و نیاز!

سب رس کا تازہ شمارہ ملا۔ غزلوں کی اشاعت کا شکریہ! زیرِ نظر شمارے کے اداریئے میں حسبِ حالاتِ حاضرہ کے سیاسی تناظر میں پیش کردہ خیالات اس مرتبہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ آج جس فرقہ پرستی کی بڑھتی ہوئی زرد آندھی اور زعفرانی یلغار کا ہم سامنا کر رہے ہیں وہ بقول آپ کے اس کا بیج کانگریس کے دور ہی میں بو دیا گیا تھا۔ بہ مصداق

لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

اس ایک لمحے کی خطا کا جھروکہ آج ہندو پریشد، بجرنگ دل اور ہندوتا کے کھلے ہوئے آہنی دروازوں کی شکل دھار چکا ہے۔ ایک ڈاکٹر حامد انصاری ہی نہیں اس بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کے خلاف اشارتاً اور جسارتاً کئی قائدین اور رمندو بین بھی اپنی آواز اٹھا چکے ہیں لیکن یہ آواز مودی کی سرکار کے نقار خانے میں مجروح طوطی کی آواز بن کر رہ گئی ہے۔ امن کے کبوتر کی جگہ اب ہمارے اجداد اور اسلاف کے آستانوں اور گنبدوں پر زعفرانی چیلیں اور بجرنگی گدھیں منڈلا رہی ہیں۔ وزیر اعظم مودی کی ''موذیانہ'' خاموشی اس خونین آندھی کو بڑھاوا دینے کا اشارہ ثابت ہو رہی ہے جو اقلیتی طبقے کے لیے بے چینی اور اضطرابی کے گہرے دھانے سے سر اٹھاتے ہوئے ایک انقلاب کا منادی ہے۔

بقول ساحر لدھیانوی:

فوج حق کو کچل نہیں سکتی
فوج چاہے کسی یزید کی ہو
لاش اٹھتی ہے پھر علم بن کر
لاش چاہے کسی شہید کی ہو

نور الحسنین نے اپنے افسانے میں انسانی زندگی کی بڑے قدروں کی اچھے انداز میں منظر کشی ہے۔ افسانے کے بعض جملے یقیناً ذہن و فکر کو جھنجھوڑتے ہیں۔ فیاض رفعت نے حضرت مجتبیٰ حسین کی بے مثال فن کاری کا نور اوراق میں پھیلا کر ہمارے دل اور دماغ کو مزید منور کر دیا ہے۔ حضرت موصوف کا اسلوب، آہنگ اور لب و لہجہ خود ان کی اپنی تحریروں کا روشن مقدر بن چکا ہے۔ بقیہ مضامین محتاج مطالعہ ہیں۔ پتہ نہیں پھر مطالعہ کے جراثیم کب بے دار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ بہ ہمہ وجوہ خوش رکھے۔

علیم صبا نویدی۔ چینائی

بھائی بیگ احساس ____ تسلیمات!

سب رس ماہ ستمبر ۲۰۱۷ء نظر سے گزرا۔ آپ واقعی دادا کے واجب مستحق ہیں کہ آپ نے نہ صرف اردو شاعری بلکہ اردو ادب کی موجودہ صورت حال پر چند سطور میں اداریئے کے طور پر اپنے غم اور غصہ کا اظہار کیا۔ میں آپ کے غم اور غصے میں برابر کا شریک ہوں مگر ان چند سطور کو اداریئے کا درجہ دینا بھی مناسب نہیں۔ یہ چند سطور معنی خیز تو ہیں مگر تشنہ ہیں۔ یہ احتجاجی اظہار خیال وضاحت طلب ہے اور مزید توجہ چاہتا ہے۔

کوئی قوم یا زبان جب زوال پذیر ہونے لگتی ہے تو کچھ عجیب قسم کی صورت حال رونما ہونے لگتی ہے۔ اردو شاعری بھی اسی بحران میں غوطہ زن ہے۔ اردو شاعری یا اردو مشاعرے اب نوٹنکی میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اندیشہ یہ بھی ہے کہ کہیں سمینار بھی ناٹک کا روپ اختیار نہ کر لیں۔ ویسے بھی سمیناروں میں صرف پرانے ادب کی ''جگالی ہی ہو رہی ہے۔ اردو شاعری اب صرف سطحی

تفریح اور ذہنی عیاشی کا سامان فراہم کررہے ہیں۔ غیر اردو داں طبقے اور کم علم لوگوں نے ''دروپدی کا چیر ہرن'' کردیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اردو شاعری اب ایک انڈسٹری کا روپ اختیار کرچکی ہے۔ جس کا مقصد ہے ذریعہ معاش اچھا ترنم، مصنوعی صورتیں، ڈرامائی، انداز گفتگو تھیٹر کے انداز میں مکالموں کی ادائیگی تالیاں بٹورنے کے لیے اور شب گزاری کے لیے کافی ہیں۔ جن لوگوں کے گھروں پر چوہے تک فاقے کرتے تھے۔ وہ اب مزے میں ہیں اور قورمہ روٹی کھا رہے ہیں۔ مصنوعی صورتیں لیے خواتین جو اردو کی ابجد سے بھی واقف نہیں مقبول عام ہیں۔ ملک اور بیرون ملک اردو شاعری کی جو نمائندگی ہورہی ہے۔ اس نے ملک کی ادبی اور ثقافتی تاریخ کو دوراہے پر کھڑا کردیا ہے۔

آج کے دور میں تہذیب اور ثقافت کی کوئی اہمیت نہیں اب اردو زبان کا ادب سے رشتہ ''طلاق'' کی منزل تک پہنچ گیا ہے۔ معاشرہ اب روبہ زوال سے گنگا جمنی تہذیب کا جنازہ اٹھ چکا اور اس کا تابوت خاموشی سے سپرد آتش ہوگیا۔ تقسیم وطن کے وقت جو طبقہ اپنے سینے سے اردو کو لگائے مہاجر کی صورت میں آیا تھا اس نے اپنی شناخت بنانے کی کوشش کی مگر حالات کے مدنظر اس طبقے نے خاموشی سے خود کو علیحدہ کرلیا۔

پی پی سریواستو رند۔ نوائڈا

ماہ نامہ 'سب رس' کا ستمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سب رس جنوری 1938ء سے زبان وادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس شمارہ کا جلد نمبر 79 شمارہ 9 ہے اس کی مجلس ادارت میں اکابر ادب شامل ہے جن میں سرپرست راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر جی، صدر جناب زاہد علی خاں، معتمد عمومی پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور اور مجلس مشاورت میں پروفیسر گوپی چند نارنگ جناب مجتبیٰ حسین اور پروفیسر اشرف رفیع وابستہ وشامل ہیں۔ مدیر پروفیسر بیگ احساس کی ادارت میں 2010ء سے شائع ہورہا ہے تب سے اندرونی و بیرونی ساخت ہیئت گٹ اپ سٹ اپ میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور رنگین انداز میں چھپ رہا ہے اس کے اداریئے سیاسی، سماجی حالات کوائف سے مربوط ومزین ہوتے ہیں اور معلومات کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ زیر مطالعہ شمارہ کا اداریہ ایک اور صحافی کی موت گوری لنکیش کے قتل پر اظہار تاسف کرتے ہوئے کہا کہ گوری لنکیش بھی ایم ایم کلبرگی، دابھولکر اور پنسارے سے جاملیں صحافی حق اور حقائق اور سچائی کا پاسبان ومحافظ ہوتا ہے وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ سے سچ اور سچائی کی تشریح کرتا رہتا ہے صحافی قوم و ملک کا اثاثہ میں ہوتا ہے حکومت کی راہ نمائی جمہوریت کو تقویت وفروغ عطا کرتا ہے۔ اک دن اچھے اور سچے صحافی کی جان کو خطرہ لگا رہتا ہے اس رجحان کی بیخ کنی کرنا ضروری ہے اداریہ میں مدیر پروفیسر بیگ احساس نے ایک اچھے اور سچے صحافی کی صفات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں بے باک صحافت کی روایت برسوں پرانی ہے لیکن اب ملک میں غیر جانب دار حق گو، بے باک وسیع النظر صحافیوں کے لیے زمین تنگ ہورہی ہے اب باضمیر صحافی یا تو مارے جاتے ہیں یا ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور جو صحافی بچے ہیں ان کی زندگیوں کو بھی خطرہ ہے لیکن صحافت کا گلا گھونٹ کر کوئی بھی ملک ترقی نہیں کرسکتا صحافت وصحافی قوم وملک کی امانت ہے اثاثہ ہے ملک وقوم کو ترقی عطا کرتے ہیں صحافت کا اہم رول ہوتا ہے۔ عبدالستار دلوی نے مراٹھی کے حوالے سے ترجمہ کی لسانی تبدیلی معنویت پر معلوماتی انداز سے روشنی ڈالی ہے ترجمہ کا عمل زبان کو فروغ عطا کرتا ہے زبان وسیع ترقی حاصل کرتی ہے لیکن ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے جب کہ مترجم دونوں زبانوں کی تہذیب و روایت اور لسانی خصوصیت سے بے خبر ہو۔ انھوں نے مرٹھی سے اردو زبان میں ترجمہ کرنے والوں کی تفصیل لکھی ہیں اور ان کی خصوصیات بیان کی ہیں اس شمارے کے دیگر

مشمولات اہم اور Innovase انداز کے ہیں۔ خاص طور پر غضنفر کی کرب جاں مثنوی ہے 1947ء کے بعد مثنوی لکھنے والوں میں بہت کم شاعر ہیں سردار جعفری نے جمہور نامہ لکھا لیکن کرب جان مثنوی کا صغیر افراہیم نے ایسا تجزیہ کہ جس سے معلوم پڑتا ہے کہ یہ مثنوی سحر البیان اور گلزار نسیم کے نہج پر لکھی گئی ہے۔ داستان اور مثنوی کا دور 1857ء سے پہلے کا ہے اس کے تقاضے پس منظر حالات تقاضے تو اور ہوتے ہیں لیکن کرب جاں 21 ویں صدی میں تخلیق ہوئی ہے اس کا موضوع حالات حاضرہ ہے اور حقیقت کی عکاسی ترجمان ہے تو اس کی کتنی پذیرائی ہوگی۔ یہ تو وقت بتلائے گا۔ کیوں کہ مثنوی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ غضنفر صاحب Fiction کی دنیا میں معروف ہیں تجزیہ نگار نے یہ بھی لکھا کہ اس مثنوی میں Fiction ناول کا امیج نظر آتا ہے اور منظوم Fiction ہے۔ نئے دور میں پرانے ادبی قدروں کی دریافت ہوئی ہے دیگر مضامین و مقالے معیاری اور ادبی معلومات سے پُر ہیں۔ میں مدیر صاحب اور ان کے رفقاء کار کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس پرچہ کو ہند کے اعلیٰ معیاری پرچوں میں لا کھڑا کیا اور اردو دنیا کا معیاری پرچہ ہے۔ ایک عرصہ سے سب رس میں دکنی و دکنیات سے متعلق مضامین شائع نہیں ہو رہے ہیں کیا یہ اچھا ہوتا آئندہ شماروں میں دکنی ادب، تحقیق، تخلیق پر مضامین شائع کریں۔ ڈاکٹر زورؔ نے سب رس کو دکنی ادب کے لیے وقف کیا ہے دکنی ادب کے فروغ اس کی اشاعت ترویج کے لیے سب رس جاری کیا ہے۔ اس میں دکنی ادب کو اولین ترجیح دی جانی چاہیے۔ مدیر پروفیسر بیگ احساس کی ادارت میں رسالہ بہت ترقی کر گیا۔ اس کے اداریئے عوامی شعور اور کوائف کو لیے ہوتے ہے۔ 2010ء سے اس میں انقلابی تبدیلی لائی گئی اور مضامین و مقالے جدت و ندرت لیے ہوتے ہوئے ہیں۔ عصری دور میں اس طرح کے معیاری ادبی رسائل انگلیوں پر گننے کے لائق ہیں۔ ان میں سب رس بھی ایک ہے۔ **محمد ناظم علی۔ نظام آباد**

قابل قدر و احترام پروفیسر بیگ احساس صاحب ___ سلام و اکرام!

سنا تھا پچھلے دنوں خاکسار کی دو غزلیں سب رس میں جگہ پا گئی ہیں، اس کرم فرمائی کے لیے آپ کا دل سے شکر گزار ہوں، کیوں کہ اس دور میں تو لوگ شاعری کے وجود کو تک بندی کا خطاب دے کر انکار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ایسے شعر بے زار ماحول میں دور دراز کے کسی شاعر کی تخلیقات کو 'سب رس' ایسے اہم رسالے میں جگہ مل جائے تو محسوس ہوتا ہے ک ابھی شاعری کو پسند کرنے والے اور اس کی ''ترسیل'' میں دلچسپی رکھنے والے مدیران ادبی دنیا میں موجود ہیں۔ ورنہ گوشہ کے نام پر تک بندی کرنے والوں کی معمولی تخلیقات کو اعلیٰ معیار کی سند عطا کرنے والے مدیران کی کوئی کمی نہیں ہے۔

اور ناقدین کا تو یہ حال ہے کہ ان کی دوست دار نگاہیں اپنے گروہ کے قلمکاروں کی گرفت سے باہر دیکھنے کی جسارت سے ہی محروم ہو چکی ہیں، اس لیے روز کسی نہ کسی صورت میں پڑھنے کو مل جاتا ہے کہ اب شاعری مسلسل پستی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جب کہ جدید شعراب بھی بہترین شاعری کر رہے ہیں۔ ماہنامہ 'شاعر' ممبئی کے مدیر محترم افتخار امام صدیقی صاحب نے ایک روز مجھ سے فون پر کہا مجھے نئی نسل کی غزل میں ایک مصرع بھی ڈھنگ کا نظر نہیں آتا ہے۔ اور اگست ۲۰۱۷ء کے شمارے میں اعلان کرتے ہیں کہ شاعر کا عصری غزل نمبر جلد منظر عام پر لایا جائے گا۔ اس صورت حال پر 'سب رس' کا کوئی ایک اداریہ ہو جائے تو لطف آ جائے گا۔ کیوں کہ آپ کی ہلکی آواز بھی پوری اردو دنیا میں گونجتی ہوئی سنائی دے گی۔ آپ چاہیں تو نئی نسل کی قابل اشاعت تخلیقات کے لیے سب رس کے چند صفحات کو مختص کر سکتے ہیں اور یہی ثابت کر سکتے ہیں کہ نئی نسل کے اندر ابھی شعری روشنی باقی ہے۔

شارق عدیل۔ ایٹہ

خواجہ احمد فاروقی کی وجہ سے ہی دہلی میں اردو پھل پھول رہی ہے: گوپی چند نارنگ

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام لٹریری فورم پروگرام کا انعقاد

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام خواجہ احمد فاروقی کی پیدائش کے سو سالہ جشن کے طور پر ایک لٹریری فورم پروگرام کا انعقاد اکادمی کے صدر دفتر، رویندر بھون، نئی دہلی میں کیا گیا جس کی صدارت اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پدم بھوشن اور ساہتیہ اکادمی کے نیشنل فیلو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں خواجہ احمد فاروقی کو یاد کیا اور ان کو خراج تحسین پیش کیے۔ انھوں نے وہ زمانہ باور کیا جب بادِ مخالف کے باوجود خواجہ صاحب نے اپنی محنت اور لگن سے دہلی یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم کیا۔ خواجہ صاحب کی جاذب شخصیت کی وجہ سے وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے شعبہ کے قیام میں خصوصی دلچسپی لی۔ آج دہلی میں جو اردو پھل پھول رہی ہے وہ خواجہ احمد فاروقی کی ہی دین ہے۔ دہلی والوں پر ان کا یہ احسان ہمیشہ رہے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہر چند کہ خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی کے اوراقِ گزشتہ کی ایک داستانِ پارینہ بن چکے ہیں اور نئی نسلوں نے بس اُن کا نام ہی سنا ہے لیکن میرے لیے وہ اب بھی شوق کا ایک دفتر اور اردو کی آرزومندی کا ایک استعارہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دوسرا خواجہ احمد فاروقی پیدا نہیں ہوسکتا۔

اس موقع پر پروفیسر محمد ذاکر نے خواجہ صاحب کی زندگی پر روشنی ڈالی اور انھیں باوصف، باصلاحیت اور مشفق استاد کے طور پر یاد کیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے فاروقی صاحب کو اردو ادب کا لجنڈ بتاتے ہوئے کہا کہ خواجہ صاحب اپنی تحریروں میں علم کی دریا بہاتے تھے۔ انھوں نے اردو کو وافر ادبی سرمایہ فراہم کرایا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ پہلے زبان پر قدرت حاصل کرو۔ زبان کے بغیر ادب ممکن نہیں۔ ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے 'خواجہ فاروقی: خطوط کے آئینے میں' عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ خواجہ صاحب کے خطوط بنام نارنگ سے پرت در پرت ان کی شخصیت کے اتنے روپ کھلتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ان میں جہد و امن اور علم و آگہی کا کیسا الاؤ روشن تھا جس کا مرکز و محور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور اردو زبان تھی۔ انھوں نے شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے قیام کے حوالہ سے کہا کہ جس پودے کو فاروقی اور نارنگ صاحبان نے اپنے خونِ جگر سے سینچا، پالا اور پروان چڑھایا، آج وہ تناور درخت بن چکا ہے جہاں سے ہر سال سیکڑوں طالب علم فارغ ہوکر ملک کے گوشے گوشے میں علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں لیکن وہ ہستی گمنام رہی جس نے یہ چمن آراستہ کیا۔

پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر جناب چندر بھان خیال نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ان کا مختصر تعارف پیش کیا۔ انھوں نے اکادمی کے ذریعہ منعقدہ اس پروگرام کی غرض و غایت سے سامعین کو روشناس بھی کرایا۔ آخر میں تمام مندوبین اور شرکا نے ساہتیہ اکادمی کے اردو انچارج جناب محمد موسیٰ رضا کا پروگرام کے شاندار انعقاد کے لیے مبارکباد پیش کی۔ اس موقع پر خواجہ احمد فاروقی کی صاحبزادی ڈاکٹر فرحت فاطمہ اور افراد خانہ کے علاوہ کافی تعداد میں اردو کے شائقین شریک ہوئے جن میں مسز منور مانا رنگ، پروفیسر شہزاد انجم، ظہیر احمد برنی، ترنم ریاض، شہلہ نواب، رینو موہن بھان، حنیف ترین، سہیل انور، ابوظہیر ربانی، علاء الدین خاں، انصاری اطہر حسین، محمد عمران، غلام نبی کمار، سلمان عبدالصمد وغیرہ شامل تھے۔

Dr. Mansoor Khushter
Editor Darbhanga Times,
Purani Munsifi, Darbhanga - 846 004.

Mr. Kausar Siddiqui
Editor "Karwan-e-Adab", Zeb Villa, # 79-A,
Ginnori Road, Bhopal - 462 001

Mr. Rashid Anwar Rashid
Associate Professor,
Dept of Urdu, Aligarh Muslim University,
Aligarh - 202 002

Mr. Mahtab Qadr
General Secretary, Gulf Urdu Council
President Urdu Gulbun, Jeddah

Mr. Shariq Adeel
P.O. Marehra, Dist: Ettah, U.P. 207 401

Mr. Ahmed Nesar
Kids Campus School, Mohammad Ali Raod
City Colony, Post-B, Dist: Dhanbad
Jharkhand - 828 130

Mr. M. Qamar Saleem
Flat No.3, Atmashanti CHS, Plot No. 33,
Sector-3, Vashi - Navi Mumbai - 400 703

Mr. Rind Sarshar
Tolichowki, Hyderabad - 500 008

Mr. Izhar Warsi
Brahmanipura, Bahraich - 271 801

Dr. Nusrat Jabeen
Assistant Professor, Deptartment of Urdu
Central University, Kashmir, Nowgam, Srinagar.

Dr. Amena Tahseen
Associate. Professor, Dept of Women Education
MANUU, Gachibowli - 500 032. Hyderabad.

Mr. Naseem Mohd Jan
Marifat Book Emporium, Sabzi Bagh, Patna -4.

Mr. Krishan Kumar Toor
134/E, Khanyara Road, Dharamshala - 176 215

Mr. Mohd. Abid Ali Abid
10, Gulistan Colony, Badam Nagar,
Aligarh, Uttar Pradesh - 202 002

Dr. Raoof Khair
9-11-137/1, Moti Mahal, Golconda,
Hyderabad - 500 008

Mr. Jamal Qudoosi
Jamal Traders, Barhni Road, Ottwa
Bazar, Siddarth Nagar, U.P. - 272192

Dr. Masood Jafri
8-1-43/1/A/5, P.O. Shaikpet, Hyd - 500 008

والا شان مکرم جاہ و بیاد راشہزادی پرنسس اسری، عثمان چوتھی، حیدرآباد دکن

Regd No. H-HD 970-2015-2017 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-10 October, 2017 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

سیاست

حیدرآبادی دور،
ثقافت اور طرز زندگی کا
مصدقہ عکاس!

سیاست آج تک کے مؤقر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ سیاست نے بیرونِ ممالک میں بسے ہوئے اردو قارئین کی روزمرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روانہ بذریعہ ہوائی جہاز مشرق وسطیٰ، یو کے، یو ایس اے اور کینیڈا از بسل عمل میں آتی ہے۔

...اور وہ حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، سیاست کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، ذائقہ اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائٹ جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ ہٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے اردو زبان سے واقف قارئین کے دل تک رسائی حاصل کر کے ایک بار پھر بطور روزنامہ اپنی مقبولیت کو ثابت کر رہا ہے۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : 24744180, 24603666, 24744109, 24744114
Fax : Editorial : 040-24603188, Advertisement : 24610379
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام سیاست

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taaha Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (A.P.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469